# تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری میں ترقی پسند عناصر: تقابلی مطالعہ

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو)


محقق

رضا علی عابدی

رجسٹریشن نمبر: 257-FLL/MSURDU/F20

نگران

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد



INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY ISLAMABAD

CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD



شعبۂ اردو

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد


۲۰۲۳ء

Accession No. TH-27122

MS
891.4391
ع ا ت

اُردو ادب - شاعری - تحقیق و تنقید

# تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری میں ترقی پسند عناصر:
# تقابلی مطالعہ

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

رضا علی عابدی

رجسٹریشن نمبر: 257-FLL/MSURD/F20

**مقالہ برائے ایم ایس (اردو)**

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اردو)

کی ڈگری جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

**شعبۂ اردو**

**کلیۂ زبان و ادب**

**بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد**

# مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور ایم ایس اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری میں ترقی پسند عناصر: تقابلی مطالعہ"**

مقالہ نگار: رضا علی عابدی

رجسٹریشن نمبر: 257-FLL/MSURDU/F120

# کمیٹی دفاعِ مقالہ

ڈاکٹر نعیم مظہر
ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ اُردو، نمل، اسلام آباد
**بیرونی ممتحن**

ڈاکٹر غلام فریدہ
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
**اندرونی ممتحن**

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
**نگران مقالہ**

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
**چیئرپرسن، شعبہ اردو**

**اگست، 2023ء**

# اقرار نامہ

میں رضا علی عابدی رجسٹریشن نمبر 257-FLL/MSURDU/F20 حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان "**تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری میں ترقی پسند عناصر: تقابلی مطالعہ**" میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ایم ایس (اردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر کامران عباس کاظمی کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

رضا علی عابدی

مقالہ نگار

# تصدیق نامہ

رضا علی عابدی رجسٹریشن نمبر 257-FLL/MSURDU/F20 کے تحت اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو بعنوان "**تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری میں ترقی پسند عناصر: تقابلی مطالعہ**" میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحن کو بھجوا دیا جائے۔

**ڈاکٹر کامران عباس کاظمی**

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

# فہرست

**باب اول :** ترقی پسند بیانیہ اور منتخب شعرا: تجزیہ و تقابل

**باب دوم :** سماجی مسائل کے تناظر میں منتخب شعرا کا مطالعہ: تجزیہ و تقابل

**باب سوم:** طبقاتی و سماجی شعور کے تناظر میں منتخب شعرا کا جائزہ: تقابلی مطالعہ

**باب چہارم :** احتجاج، انقلاب، مزاحمت اور بغاوت کا ترقی پسند بیانیہ اور منتخب شعرا: تجزیہ و تقابل

ماحصل

# سپاس نامہ

میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر گزار ہوں کہ جس نے مجھے شعور کی روشنی سے منور کیا۔ جس نے مجھے تحقیقی مقالے جیسے پر پیچ اور سنگلاخ راستے پر کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ میں رب لم یزل کے بعد اپنے والد محترم محمد مشتاق مغل، والدہ محترمہ شمیم بی بی اور اپنی بہنوں اور بھائیوں کا شکر گزار ہوں جن کی بدولت میں آج اس مقام پر پہنچا ہوں۔

اس کے ساتھ ساتھ اپنے آج تک کے تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے لفظ کی توقیر سکھائی۔ جنھوں نے علم کے نور سے میری فکر کو جلا بخشی۔ میں بالخصوص اپنے نگران ڈاکٹر کامران عباس کاظمی کا سپاس گزار ہوں کہ جنھوں نے ثابت کیا کہ ایک مثالی، شفیق استاد کو کیسے ہونا چاہیے۔ میں ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر اشعر معراج کا بھی شکر گزار ہوں۔ میں اپنے بھائی ذیشان عالم کا تہہ دل سے شاکر ہوں جنھوں نے پروف خوانی میں میری معاونت کی۔ میں اپنے برادر جناب سید شاہ نواز نقوی کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالے کی تدوین میں میری معاونت کی۔

میں اپنے تمام دوستوں اور اہل خانہ سمیت ان تمام احباب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح میری معاونت کی۔ میں سب کی صحت، سلامتی اور زندگی کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ پاک سب کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے اور دو جہانوں میں سرخرو کرے۔

رضا علی عابدیؔ

۲۶ مئی ۲۰۲۳ء

# باب اول

## ترقی پسند بیانیہ اور منتخب شعرا تجزیہ و تقابل

بیسویں صدی انسان کی معلوم تاریخ میں سب سے ہنگامہ خیز صدی واقع ہوئی ہے۔ اس صدی میں دنیا نے انقلابات، عالمی جنگیں، نازی ازم، فسطائیت، اشتراکیت سمیت صنعتی و سائنسی انقلابات کو ابھرتے ہوئے دیکھا۔ بیسویں صدی کے اس عالمی منظر نامے کے پس منظر میں اگرچہ ایک طویل سفر تھا جو عالم انسانیت نے کئی صدیوں تک طے کیا۔ زرعی عہد سے صنعتی عہد تک کا یہ سفر انتہائی گنجلک اور پیچیدہ تھا۔ عالم انسانیت نے اس پورے عہد میں بے شمار قربانیوں کے نتیجے میں ایک پورے نئے سماج کی بنیادیں استوار کیں۔ اس نئے مشینی عہد نے ہر شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا۔

اس نئے مشینی عہد کا ایک بڑا کارنامہ عقلیت پسندی، روشن خیالی اور خرد افروزی بھی تھا۔ سائنس کے فروغ نے انسانی ذہن کے در وا کیے اور زندگی کے تمام شعبوں میں سائنسی عقلیت کو فروغ حاصل ہوا۔ صنعتی عہد کے اس پورے عہد نے تمام شعبوں پر ان مٹ نقوش مرتب کیے۔ فلسفہ، منطق، آرٹ، ثقافت سمیت زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں تھا جس نے اس بدلتے ہوئے دور کے اثرات کو محسوس نہ کیا ہو۔

زندگی کے ان تمام شعبوں کی طرح اس عالمی منظر نامے سے ادب بھی متاثر ہوا۔ ہزاروں سالوں سے ایک ہی ڈگر پہ چلتے ہوئے ادب کے اس سفر میں نئے زاویے، تحریکیں، افکار شامل ہوئے۔ ادیب انسانی سماج میں رہتا ہے۔ خارج میں ہونے والے واقعات اور حالات اس کے داخل پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ادب اس کے داخلی اور خارجی جذبات اور حالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے ادب کسی بھی سطح پر اپنے سماج سے بالکل الگ ہو کر وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔

بیسویں صدی کے ان اثرات نے ساری دنیا کی ادبی تحریکوں کو متاثر کیا۔ ادب کے اندر نت نئے تجربات کیے گئے۔ نئی اصناف اور ہیئتوں کے تجربات کے ساتھ ساتھ پہلی مرتبہ ادیب کے مقام پر بحث کا آغاز ہوا۔ یہ وہ دور تھا جس نے اردو ادب کے اوپر بھی اثرات مرتب کیے۔ انگریز اگرچہ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت برصغیر میں آئے تھے اور یہاں تجارت کے نام پہ سیاسی طاقت حاصل کر کے سارے برصغیر پر قابض ہوئے مگر انگریز کی آمد سے یہاں پر سائنس اور صنعتی ترقی کو فروغ حاصل ہوا۔ سائنس کے فروغ نے سماج میں تبدیلیوں کو جنم دیا۔

انگریزوں نے دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج جیسے ادارے قائم کیے۔ جس کے نتیجے میں مغربی تحریکوں اور ادب سے اردو ادب کے ادیب اور شعرا روشناس ہوئے۔ انیسویں صدی میں عقلیت پسندی کی تحریک نے جڑیں پکڑنا شروع کیں بعد ازاں اس عقلیت پسندی اور روشن خیالی کے نتیجے میں ادب کے مقصد کو متعین کرنے پر بھی پہلی مرتبہ بحث ہوئی۔ روس کے سوشلسٹ انقلاب کے نتیجے میں ادب کے افادی پہلوؤں پر پہلے سے زیادہ زور و شور سے

بحث ہوئی۔ دنیا بھر میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمنیں اور کانفرنسیں قائم ہونے لگیں۔ اگرچہ اس سے قبل بھی اردو ادب میں شخصی سطح پر عقل پسندی اور روشن خیالی کی مثالیں موجود تھیں مگر شخصی سطح پر غالب اور سرسید کی یہ مثالیں کسی باقاعدہ تحریک کا پیش خیمہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ غالب اور بعدزاں سرسید احمد خاں حصہ بقدر جثہ اس عمل میں شریک رہے۔ جس کے نتیجے میں اردو ادبا اور شعرا میں روشن خیالی کو مقبولیت ملنے لگی۔

عالمی سطح پر ترقی پسند ادب اور شعرا اس بات کے لیے میدان تیار کر رہے تھے کہ ادب اور ادیب باقاعدہ طور پر ادب زندگی اور سماج کے تعلق کو سمجھیں اسی سلسلے میں جولائی ۱۹۳۵ء میں روشن خیال اور ترقی پسند ادیبوں نے پیرس میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس بلائی۔ جس میں عالمی سطح پر ادب کی انفرادی حیثیت کے بجائے اجتماعی حیثیت کو اجاگر کرنے کی تحریک کا اعادہ کیا گیا۔ ہندوستان سے اس کانفرنس میں شریک سجاد ظہیر، راج آنند، جیوتی پرشاد اور ڈاکٹر تاثیر بہت متاثر ہوئے۔ یوں باقاعدہ ترقی پسند انجمن کے قیام کے لیے باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں اور باقاعدہ مسودہ تیار کر کے ہندوستانی ادیبوں کو اس میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔

اس انٹرنیشنل کانفرنس سے قبل ہی ہندوستان میں ادیبوں نے ادب کے ترقی پسند بیانیے اور کردار کے حوالے سے کام شروع کر دیا تھا۔ اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھ پوری کے مقالات اس حوالے سے اولین دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

> "ہمارے خیال میں ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی ایک مکمل اکائی ہے۔ اور ادب زندگی کا آئینہ اور کاروان حیات کا رہبر ہے۔ ہم نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ ادب قالب کیا ہو مگر۔ یہ نہیں بتایا کہ اس قالب کا رنگ وروپ کیا ہو؟ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا کہنا ہے؟ اور کن سے کہنا ہے؟ کیسے کہنا ہے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر کے دکھائیں کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں۔"(۱)

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک ایک خاص قسم کے سماجی حالات کا نتیجہ تھی۔ اس تحریک کے پس پشت کوئی ایک واقعہ یا سانحہ نہیں تھا بلکہ ترقی پسند تحریک انیسویں اور بیسویں صدی کے ان تمام عوامل کا نتیجہ تھی جنھوں نے اس صدی کو متاثر کیا۔ ادب پر ان عوامل کے براہ راست اثرات نظر آتے ہیں۔ صنعتی عہد میں یورپ کی احیائے علوم کی تحریک نے خرد افروزی اور روشن خیالی کا سفر جو شروع کیا۔ گاہے بگاہے اس سفر میں یورپ کے ان تمام نابغہ روزگار ادبا، شعرا، فلاسفرز نے حصہ ڈالا۔ روسو، والٹر، مونٹسکو، کانٹ، فائر باخ، ہیگل، نطشے، فطشے جیسے علماء نے ادب

سماجیات فلسفہ تاریخ جیسے علوم میں گراں قدر اضافہ کیا انہی مغربی مفکرین میں کارل مارکس (جو کہ ایک جرمن مفکر تھا) نے مغرب میں سرمایہ دارانہ نظام کہ جبر و استحصال کا سائنسی مطالعہ کرتے ہوئے سائنسی سوشلزم کی بنیاد رکھی اس نظریے نے یورپ سمیت ساری دنیا کہ ممالک میں مقبولیت حاصل کی۔ کارل مارکس کا نظریہ بنیادی طور پر معاشی نظام پر مبنی تھا۔ مگر مارکس کی اس فکر نے زندگی کہ دیگر شعبوں کی طرح ادب پر بھی گہرے نقش ثبت کیے۔ یورپ سے لے کر ساری دنیا میں اس نظریے کے اثرات عام ہوئے۔ بالخصوص روس کے ادیبوں اور شعرا نے ادب میں انسانی زندگی کے حقیقی نقش کو پیش کیا اور بعد ازاں ان کی قیادت میں دنیا کا اولین سوشلسٹ انقلاب روس میں برپا ہو۔ انور سدید کے بقول:

> "یہ زمانہ سیاسی اور سماجی تحریکوں کے لئے اس لیے بھی ساز گار تھا کہ عوام اب اپنی جانب دیکھنے پر مائل ہو چلے تھے اور غلامی کا جوا اتارنے پر مائل تھے روس کے انقلاب عظیم نے دنیا بھر کے نچلے طبقے کی آنکھیں کھول دیں تھیں اور سماجی انصاف اور مساوات ممکن العمل نظر آنے لگے تھے چنانچہ اس دور میں ہندوستان میں جو تحریکیں پیدا ہوئیں ان میں کچلے ہوئے عوام کی طرف زیادہ توجہ تھی۔"(۲)

ہندوستان پر انگریز استعمار کا قبضہ تھا اس استعماری قبضے کی وجہ سے ادیبوں اور شعرا میں ایک رد عمل کی کیفیت تھی۔ انہیں روس کے سوشلسٹ انقلاب سے ایک نئے جذبے کا احساس ہوا۔ غلامی اور استحصال کے خلاف ان میں غصہ اور نفرت پیدا ہونے لگا۔ روس کا سوشلسٹ انقلاب اور انقلابی ادب بھی ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا ایک اہم محرک تھا۔ صدیوں پہ پھیلی ہوئی جاگیر دارانہ قدروں اور فرسودہ روایات کے خلاف انسانی ضمیر کو ایک آواز درکار تھی۔ اگرچہ یہ آواز اول اول منشی پریم چند سمیت چند انفرادی کاوشوں پر محیط تھی مگر اس آواز کو ایک تحریک درکار تھی جو بالآخر ترقی پسند تحریک کے قیام پر منتج ہوئی۔

ترقی پسند تحریک کے اولین بیانیے کی تشکیل میں "انگارے" کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والے اس افسانوی مجموعے نے بھی ترقی پسند ادب کے لئے راہیں استوار کیں۔ انگارے پر یہ بحث الگ سے ہے کہ یہ افسانوی مجموعہ فنی اعتبار سے کس معیار پر تھا مگر اس پر پابندی نے اسے اور زیادہ مقبول بنا دیا۔ ترقی پسند نقطہ نظر اور بیانیے کے مطابق اس میں سماجی فرسودگی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا تھا۔

> "انگارے کی بیش تر کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا۔"(۳)

"انگارے" کی اشاعت سے بہر حال ایک بحث کا آغاز ہوا ادبی مباحث میں ادب کے مقام کو موضوع بنایا گیا بعد ازاں "انگارے" میں اسی انداز میں اپنایا گیا انگارے اور شعلے اردو ادب میں بالکل ایک نئے تجربے کی طور پر سامنے آئے ان سے ہندوستان کے ادیبوں میں رومانوی فکر کے متبادل ایک فکری زاویے کا آغاز ہوا ایک نیا فکری تاثر قائم ہوا اور یوں ادب میں ایک بالکل نئی بحث کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل اردو ادب میں رومانوی تحریک سے وابستہ ادیبوں نے جذبے اور خیال کی سربلندی کے تحت جو ادب تخلیق کیا تھا وہ اب نئے قالب میں ڈھلنے کو تیار تھا۔

اگرچہ انگارے نے اس تحریک کو ایک شکل دینے کی کوشش کی تھی جہاں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر نے اس ٹھہرے ہوئے پانی میں اولین پتھر پھینک کر تحریک کو پیدا کر لیا تھا۔ مگر ابھی تک ایک باقاعدہ نظریاتی اساس کی ضرورت تھی جس کے تحت ادب کے مقام اور مقصد کا تعین کیا جا سکے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ میں اختر حسین رائے پوری نے "ادب اور زندگی" کے نام سے ایک مقالہ لکھ کر ترقی پسند تحریک کو ایک نظریاتی اساس فراہم کی یہ وہ اولین دستاویز تھی جس نے ادب کی نوعیت اور تخلیق کے مقصد کو ہی از سر نو تشکیل دیا اختر حسین رائے پوری کا مقالہ پہلے ہندی اور بعد ازاں اردو میں شائع ہوا اس مقالے میں ادب کی انفرادی حیثیت کو نشانہ بنایا گیا اور اس کے متبادل اجتماعی حیثیت کو ابھارا گیا۔ اختر حسین رائے پوری مقالے کا آغاز ہی ان سوالات سے کرتے ہیں۔

> "ادب کیا ہے؟۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی؟ ادب کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ سوال اتنے ہی پرانے ہیں جتنے علم و ادب کی زندگی اب مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ آج زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ سماج ایک دورِ تغیر سے گزر رہا ہے اور انسانیت ارتقا بالضد کے دوراہے پر آکر ایمان دار ادیب سے پوچھ رہی ہے کہ دونوں میں کس کے موئید ہو پیشہ ور گوشہ نشینی یا عوام سے یگانگی جنگلوں اور پہاڑوں کی چاہت انسان کی خدمت۔۔۔ جبر یا اختیار؟ تقدیر یا تدبیر؟ قدرت کی اطاعت یا قدرت کی حکومت؟ آرٹ آرٹ کے لیے آرٹ انسان کے لیے؟ زمین یا آسمان؟ دوئی یا یگانگی؟۔۔۔ تم دونوں میں سے کس کہ حامی ہو؟ "(۴)

اپنے مقالے کے آغاز سے ہی اختر حسین رائے پوری نے جن سوالات کو اٹھایا اپنے سوالات کے جوابات انھوں نے اپنے اس مقالے میں پیش کیے۔ اردو ادب میں یہ سوال بالکل اجنبی اور نیا تھا کہ ادب کا مقصد کیا ہے؟ اس سے قبل اردو ادب کی جتنی بھی تاریخ گزری ہے اس میں ادب کو صرف داخلی جذبات اور احساسات کا اظہار ہی سمجھا جاتا تھا۔ سرسید نے کسی حد تک اصلاحی ادب کا کام تو کیا مگر ادب کی سماجی حیثیت اور خارجی عناصر پر بحث تشنہ طلب ہی رہی تھی۔ اختر حسین رائے پوری کا یہ مقالہ بنیادی طور پر اس کمی کو پورا کرنے کی ایک عالمانہ سعی تھی۔ اس مقالے

کے ذریعے ادب برائے ادب کے نظریے پر سختی سے تنقید کی گئی۔ اختر حسین رائے پوری کے بقول ایک ادیب سماج اور زندگی کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے اس لئے ایک حقیقی ادیب کے ادب میں زندگی کی ترجمانی موجود ہونی چاہئے۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ ترقی پسند تحریک کے اولین۔ بیانیے کی بنیاد بھی بنا جیسے بعد ازاں ترقی پسند تحریک کے منشور نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تحریک کے اولین بنیاد گزاروں میں شامل تھے۔ انھوں نے "شعلے" اور "انگارے" کے ڈگر سے ہٹ کر ادب کے افکاری پہلوؤں کو اجاگر کیا اور تنقید کی نئی جہات کو تلاش کیا۔

> "ہر ایماندار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے ایسے رنگ اور نسل قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت اور مساوات کی حمایت کرنی چاہیے۔"(۵)

اختر حسین رائے پوری ایک ادیب کو مقامی قومی لسانی یا علاقائی تعصبات سے اٹھا کر ایک عالمگیر انسانی برادری کے علمبردار کی حیثیت سے متمکن کرتے ہیں۔ حقیقی طور پر اختر حسین رائے پوری کے ان نظریات کے پس پشت سوشلسٹ نظریات کی تاثیر نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں سوشلسٹ نظریات کی مقبولیت کی وجہ یہاں روسی ادیبوں شاعروں اور نقادوں کے ادب کی شناسائی تھی۔ اختر حسین رائے پوری کے نظریات پر بھی روسی ادیبوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ طالسطائی اور گورکی کے خیالات ان کے مقالے میں نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں اشتراکیت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

> "ترقی پسند تنقید میں اولین اہم نام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ہے۔ ان کا مقالہ ادب اور زندگی ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز تصور کیا جاتا ہے۔"(۶)

اختر حسین رائے پوری ادب میں محض حسن کی تلاش کے قائل نہیں۔ وہ ادب کو زندگی کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں اور آرٹ کے مارکسی تصور کے قائل ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کے نزدیک ایک حقیقی ادیب کا منصب ہے کہ وہ انسانیت کے حقیقی مسائل اور مقاصد کی درست ترجمانی کرے۔

> " صحیح ادب کا میعار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ اس کے لیے خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے۔"(۷)

وہ ادب کو زندگی کے مسائل سے الگ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے ہاں ادب کی ہئیت اور فن کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے وہ بنیادی سوال ہی اس بات سے طے کرتے ہیں کہ حقیقی ادب دراصل وہ ادب ہے جو اپنے اندر سماج کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اور اس ادب میں کل عالم انسانیت کی خدمت کا جذبہ موجزن ہو۔ چنانچہ اختر حسین رائے پوری ایک طرف ادیب کو غریب اور محکوم انسانیت کی حالت زار کو ادب کے ذریعے پیش کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہاں وہ ادب کی تخلیقیت کو اساسی سطح پر غریب اور مظلوم عوام سے منسلک کرتے ہیں۔

ادب اور زندگی میں اختر حسین رائے پوری آرٹ کے مقصد پر سوال اٹھا کر ادب برائے ادب کے نظریے کو سختی سے رد کرتے ہیں:

> "ادب برائے ادب کے علمبرداروں کا خیال ہے کہ روح اور خدا کی طرح مافوق النامین شے ہے اور جس طرح حسن و حقیقت کو عام میعار پر نہیں جانچا جا سکتا اسی طرح ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جائے۔۔۔ ادیب انسان ہے اور ہر انسان کی طرح ماحول متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے اور انسانیت اس سے اثر انداز ہوتی ہے۔ تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں۔"(۸)

اختر حسین رائے پوری ادب برائے ادب کو خود غرضی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک ادیب کسی بھی طور پر اپنے سماج سے کٹ کر اس سے قطع نظر نہیں کر سکتا اور نہ ہی ادب کسی الہامی کیفیت کا نام ہے بلکہ ادب خالصتاً خارجی اثرات سے متاثر ہونے کے عمل کا نام ہے۔ اس لیے ایک ادیب کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنے خارج میں ہونے والے محرکات اور اثرات کو جذب کرے اور حقیقی انسانی مسائل کو ادب کے ذریعے بیان کرے۔ مجموعی طور پر اختر حسین رائے پوری کے مقالے کے اہم مندرجات جو کہ ترقی پسند بیانیے کی اولین شکل ہیں کچھ یوں ہیں۔

* ادب زندگی کا ہی ایک شعبہ ہے۔
* ادب زندگی کا ترجمان ہے۔
* زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں۔
* ادیب زندگی کا اولین منصب انسانی مسائل کی ترجمانی ہے۔
* ادیب کے دل میں خدمت خلق کا جذبہ ہونا چاہیے۔

- ایک حقیقی ادیب قوم وملت اور رسوم کی پابندیوں سے آزاد ہو کر انسانیت کی وحدت کا علمبر دار ہو۔
- ادیب کو رنگ نسل قومیت جیسے جذبات کے بجائے اخوت مساوات کی حمایت کرنی چاہیے۔
- آرٹ محض تلاش حسن کا نام نہیں بلکہ انسانی سماج کی ترجمانی کا نام ہے۔

ادب کا کردار ترقی پسند انہ ہونا چاہیے جو وہ لکھتے ہیں۔

> "ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گردو پیش کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہو کر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو۔۔۔ادیب وہ استاد ہے جو کہانیوں اور گیتوں میں انسانیت کو رموز حیات سمجھاتا ہے۔ادب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں۔"(۹)

"ادب اور زندگی" محض ایک مقالہ نہیں تھا بلکہ یہ ترقی پسند تحریک کے اولین بیانیے کی تشکیل کا بنیادی متن تھا۔ جس کے ذریعے شروع میں ترقی پسند تحریک کے بنیادی خدوخال واضح ہوئے۔بعد ازاں ان خطوط پہ ترقی پسند تحریک میں سجاد ظہیر، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، عبدالعلیم نے قابل قدر اضافہ کیا۔

۱۹۳۵ء میں باقاعدہ طور پر ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے والی ترقی پسند تحریک کو "انگارے" اور "ادب زندگی" کے ذریعے اساسی بنیاد مہیا ہو چکی تھی۔اس کے علاوہ بھی اب ایک ایسا بھرپور ماحول بن چکا تھا جو ترقی پسند تحریک کے لیے سازگار تھا۔ پیرس میں ہونے والی عالمی ادبی کانفرس میں ادب کے افادی پہلوؤں کو مرکزی خیال بناتے ہوئے ادب میں زندگی کی عکاسی پر زور دیا گیا۔یہ تحریک ایک عالم گیر تحریک کے طور پر شروع ہوئی اسی سے متاثر ہو کر ۱۹۳۵ میں پہلی بار ہندوستان میں ترقی پسند انجمن کا پہلا اجلاس ہوا جس کی صدارت اردو ادب کے بہترین لکھاری منشی پریم چند نے کی۔ اپنے خطبہ صدارت میں منشی پریم چند نے ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی۔

> "ادب اس تحریر کو کہا جاتا ہے جس میں حقیقت کا اظہار ہو جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر ایسی حالت میں پیدا ہوئی ہے جب اس میں زندگی کی حیثیتیں اور تجربے بیان کیے ہوئے لٹریچر میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو۔"(۱۰)

اپنے اس طویل خطبے میں منشی پریم چند نے ادب کی تعریف نوعیت اور اغراض پر کھل کر بات کی منشی پریم چند کے اس خطبے میں ایک اعتراض تھا۔ وہ زندگی کی سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ ذوق حسن یا لطف سے کسی بھی طور پر فن برائے فن کے قائل نہیں تھے۔ ان کے خیال میں حسن کسی افرادی جذبے کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک درست ذوق حسن فطرت اور انسانی سماجی میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

> "ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے۔ اور ہم آہنگی جس کی تخلیق کرتی ہے۔ تخریب میں وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشوونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے، زندگی ہے۔ جہاں ان کا فقدان ہے وہاں اختراق، خوپروری، نفرت اور دشمنی اور موت ہے۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے۔۔۔ اس کی بدولت تہذیب نفس ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد اولیٰ ہے۔"(۱۱)

اس خطبے میں منشی پریم چند نے ادب کے ساتھ ایک ادیب کے اعلیٰ مقصد کی طرف بھی نشاندہی کی۔ ان کا زور اس بات پر تھا کہ ایک ادیب اپنے ادب کے ذریعے ایک جوش اور ولولہ پیدا کرے جس سے معاشرے میں انسانوں کو غلامی اور تنگدستی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک راہ سجھائی دے۔ منشی پریم چند اس بات کے خلاف تھے کہ ادب یا آرٹ ایک ماورائی چیز ہے اور اس کا مادی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ادب کے اس ماورائی تصور کو مبہم اور غیر واضح تصور کرتے تھے۔ ایک ادیب کبھی بھی اپنے سماج سے بے تعلق ہو کر اعلیٰ سطح کا ادب نہیں تخلیق کر سکتا۔ اس لیے اپنے سماج کی عکاسی کرتے ہوئے۔ ادب میں مساوات، انصاف، انسان دوستی اور اعلیٰ اخلاقی قدروں اظہار ہونا چاہیے اور یہ اس وقت کے دور کا تقاضا تھا۔ جمود اور سطحی ادب موت کی علامت تھا۔ ادب میں ایک تحریک روشنی، ہنگامہ اور تعمیر کا پہلو ہونا چاہئیے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس ادب میں ذوق حسن بھی ہونا چاہیے۔ اس خطبہ صدارت میں ان کے الفاظ یوں تھے:

> "جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح پیدا نہ ہو۔ روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے۔ ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پیدا نہ کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔"(۱۲)

ترقی پسند تحریک کے بیانیے میں اس خطبے کو کافی اہمیت تھی۔ یہ چونکہ انجمن کا اولین اجلاس تھا اور منشی پریم چند ایک شہرہ آفاق لکھاری کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے تھے اس لیے اس خطبے کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خود

سجاد ظہیر جو کہ اس ساری کاروائی کے منتظم اور تحریک کے روح رواں بھی تھے انھوں نے اس خطبے کو کافی پسند کیا اور ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

> "میرا اب بھی خیال ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند ادبی تحریک کی غرض و غایت کے متعلق شاید اس سے بہتر کوئی چیز ابھی تک نہیں لکھی گئی۔۔۔ چونکہ یہ ہماری زبان کے عظیم ترین حقیقت پسند افسانہ نگار کے پر خلوص خیالات کا اظہار تھا، اس لیے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ دراصل ہمارے نئے حقیقت پسند اور عوامی زندگی کے آئینہ دار ادب کا وہ کارواں جس کی رہنمائی بیس سال سے خود پریم چند اپنی نگارشات سے کر رہے تھے اب نئی اور زیادہ صاف اور نچلی سطح پر بڑھنے کے لیے تیار ہے۔"(۱۳)

یہ محض ایک خطبہ صدارت نہیں تھا بلکہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے با قاعدہ ترقی پسند بیانیے کی اولین دستاویز تھا۔ اس کانفرنس میں شریک تمام ادبا، شعرا نے اس تحریک کو خوش آمدید کیا اور کانفرنس کے اختتام پر باہمی مشاورت سے ایک اعلان نامے کا اجرا کیا گیا۔ جس میں نئے ادب خدوحال کو واضح کرتے ہوئے ادیب کو ان خطوط پر ادب کی تخلیق کا مشورہ دیا۔ اس اعلان نامے کے اہم اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

* ملک میں پستی اور رجعت پرستی کے خلاف ترقی پسند رجحان کی ترجمانی پر زور دیا گیا۔
* بے بنیاد روحانیت اور خیال پرستی کے بجائے ہندوستانی ادیب کو زندگی کی حقیقت اور اصلیت کی ترجمانی کا کہا گیا۔
* قدامت پرستی فرسودہ روایات کے بجائے عقلیت پسندی اور سائنسی شعور کو فروغ دینے پر زور ڈالا گیا۔
* ہندوستان کے نئے ادب میں زندگی کی حقیقی ترجمانی پر زور دیا گیا۔ بھوک افلاس سماجی پستی غلامی لاچاری توہم پرستی جیسے سماجی مسائل کو ادب میں اجاگر کرنے کی بات کی گئی۔

کانفرس کے اختتام پر انجمن کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

> "اول: تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرنا اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

دوم: ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ان کا ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

سوم: ترقی پزیر مصنفین کی مدد کرنا۔

چہارم: آزادی رائے اور آزادی خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔"(۱۴)

اس کانفرس کے بعد پہلی مرتبہ تحریک کی سطح پر باقاعدہ طریقے سے ترقی پسند بیانے کی تشکیل ہوئی۔ اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے تقریباً تمام معروف ادیبوں اور شاعروں نے نہ صرف اس بیانیے کو خوش آمدید کہا بلکہ انھوں نے ان ہی خطوط پر ادب کو تخلیق کرنا بھی شروع کر دیا چنانچہ ترقی پسند تحریک کے اس اثر کے تحت شاعری ناول ،ڈرامہ ،افسانہ، تنقید سمیت دیگر تمام اصناف میں ایک پوری شدت سے ابھرتی ہوئی لہر نظر آرہی تھی جس نے ادب کے اس سارے منظر نامے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

لکھنو ۱۹۳۶ میں ہونے والی پہلی کل ہند انجمن ترقی مصنفین کی کانفرنس صرف ایک ابتدا تھی اس کانفرنس میں ترقی پسند ادب کے معیار اور تعریف کو جانچا گیا اور ادب کے افادی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ بعد ازاں یہ کانفرنس بہت ساری کانفرنسز کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں دوسری کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سارے ہندوستان سے معروف ادیبوں نے شرکت کی اور تحریک کے پیغام اور پروگرام کو بہت پسند کیا اسی طرح تیسری کل ہند کانفرنس ۱۹۴۲ میں دہلی میں منعقد ہوئی جب کہ چوتھی کل ہند کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی جس میں اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کانفرنس حیدرآباد دکن میں منعقد ہوئی جس کی صدرت کرشن چندر نے کی یہ آخری کل ہند کانفرنس تھی جو تقسیم سے قبل ہوئی تھی۔

ترقی پسند تحریک کے اولین نقاش میں سجاد ظہیر کا نام سرفہرست ہے۔ یہ ان کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی جڑیں مضبوط ہوئیں لندن میں قیام کے دوران وہ سوشلزم سے متعارف ہوئے اور وہیں کمیونسٹ حلقہ احباب سے تعارف ہوا آخر دم تک اپنے نظریے سے وابستہ رہے۔ پہلے "انگارے" میں افسانوں کی ذریعے جس آگ کو انھوں نے بھڑکایا بعد ازاں "روشنائی" جیسی عمدہ کتاب اور دیگر مضامین کے ذریعے ادب میں انھوں نے ترقی پسند اور سوشلسٹ حقیقت نگاری کی طرح ڈالی۔ سجاد ظہیر حقیقی طور پر اس ساری تحریک کے روح رواں تھے۔ انھوں نے نہ صرف اس تحریک کو ایک آغاز فراہم کیا بلکہ اس کی بڑھوتری اور ترقی پسند ادب کے فروغ کے لیے بھی انھوں نے لازوال کاوشیں کیں:

"سجاد ظہیر نے ترقی پسند ادب کو نظریاتی اساس مہیا کی اور عمدہ وکالت سے اس تحریک کی سب سے نمایاں خدمات سر انجام دیں ہیں۔ ان کی کتاب روشنائی ترقی پسند تحریک کی تاریخ بھی ہے اور کسی حد تک تنقید بھی۔ ان کے نقطہ خیال میں بنیادی اہمیت مارکسیت کو حاصل ہے"(۱۵)

سجاد ظہیر بنیادی طور پر ایک مارکسٹ تھے اس لیے ان کا نقطہ ہائے نظر بھی ادب کے حوالے سے خالصتاً مارکسی تھا۔ اس لیے وہ ادب کا خالص سماجی تعین مادی حالات اور پیداواری رشتوں سے کرتے ہیں سجاد ظہیر بقول:

"فن یا آرٹ کی (اور ادب جس کا ایک جزو ہے) ہماری زندگی میں ضرورت کیا ہے۔ انسانی کی بحیثیت انسان دو خصوصیتیں ہیں۔ جو اسے دوسرے حیوانوں سے ممیز کرتی ہیں پہلے تو یہ کہ اوزار بنا سکتا ہے جن کے وسیلے سے اس نے قدرت کی قوتوں کی معیشت اور اپنے تحفظ کے لیے استعمال کرنا سیکھا۔ دوسرا یہ کہ اوزار بنانے اور کام کرنے کے دوران میں اپنی جبلی صداؤں اور چیخوں کو زبان کی شکل میں بدل سکا اور اپنا مطلب اور مفہوم ادا کرنے کے لیے اور انسانی زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے اظہار لے لیے بامعنی الفاظ اور جملوں کا اختراع کر سکا"(۱۶)

سجاد ظہیر نے اسی خالص مارکسی نقطہ نظر سے ترقی پسند بیانیے کو بنیاد فراہم کی انھوں نے ادب میں زندگی ذرائع پیداوار کے ساتھ پیداواری رشتوں کی طرف ادیبوں کو متوجہ کیا۔ اگرچہ اس سے قبل مجنوں گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری اپنے اپنے انداز میں ادب میں اس ضرورت کو پوری کرنے کی سعی کر چکے تھے مگر سجاد ظہیر نے ان انفرادی آوازوں کو ایک تحریک کی شکل دے کر پورا ادبی دبستان کھڑا کر دیا تھا۔ جس میں اردو ادب میں پہلی بار ایک نئی بحث زندگی کی ایک نئی تعبیر پیش کر رہی تھی۔ وہ ادب کے ماورائی تصور سے نہ صرف خائف نظر آتے ہیں بلکہ ان کی تمام تحریروں میں ادب کی خالصتاً سماجی اور مادی حالات کا نتیجہ گردانا جاتا ہے۔ وہ انسانی معاشرے کو مختلف طبقات اور ان کے باہمی رشتے قرار دیتے ہیں اور یہ رشتے اور حالات مادی حالات زندگی سے مکمل طور پر متاثر ہو کر تبدیلی کے عمل سے بھی گزرتے ہیں۔ روشنائی میں وہ اس خیال کی بابت یوں رقم طراز ہیں:

"خیالات نظریے اور عقیدے انسانوں کے دماغ میں نہ خود رو ہوتے ہیں اور نہ آسمان سے نازل ہوتے ہیں مادی حالات زندگی یعنی وہ وسیلے اور طریقے وہ آلات اور ذرائع پیداوار اور رسل و رسائل چھین استعمال کر کے انسانوں کے گروہ اپنے کھانے پینے اور

رہنے سہنے کے وسائل حاصل کرتے ہیں۔ انسانی معاشرے کی شکل و صورت متعین
کرتے ہیں"۔ (۱۷)

سجاد ظہیر تمام فنون،(آرٹ فلسفہ ) کو آج ہمارے سماج اور تمدن کا حصہ ہیں انسانیت کی جسمانی و ذہنی کاوشوں کا نتیجہ گردانتے ہیں۔ اپنی اسی کتاب میں وہ آگے چل کر ایک حقیقی ترقی پسند ادیب کے منصب کو ان الفاظ کے ساتھ واضح کرتے ہیں:

"ترقی پسند ادیب کے دل میں نوع انسان سے انس اور گہری ہمدردی ہونا ضروری ہے۔
بعض آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ناممکن نہیں۔"(۱۸)

سجاد ظہیر کے ان اقتباسات کے مطالعہ سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ وہ کائنات کے حرکی نظریے کے قائل تھے۔یعنی کے کائنات متغیر ہے۔ سماج، تاریخ، تہذیب جب تبدیل ہوتے ہیں تو تبدیلی کے یہ امکانات ایک ادیب کی سوچ کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ "روشنائی" کے علاوہ "مضامین سجاد ظہیر" میں بھی انہی موضوعات پر طویل بحثیں ملتی ہیں۔ وہ انسانی زندگی اور ادب کو الگ کرنے کے قائل ہیں اور ادب کے اس مبہم اور غیر واضح تصور کو رد کرتے ہیں۔ سید محمد عقیل سجاد ظہیر کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

"سجاد ظہیر کی تقریباً تمام تحریروں میں انسانی زندگی سے قریب ہو کر ہی انسان کے ہر
فکر و عمل کی تشریح اور تعبیر کی گئی ہے۔"(۱۹)

سجاد ظہیر اپنی انفرادی حیثیت کے علاوہ ایک تحریکی شخصیت کے مالک تھے اس لیے انھوں نے اردو میں جس چلن کو عام کیا بہت سارے ادیبوں، نقادوں اور شاعروں نے ان کی فکری تقلید کی۔ سجاد ظہیر اپنی ذات میں خود ایک رجحان ساز شخصیت تھے۔ ان کی فکر کے اثرات کو عمومی ترقی پسند بیانیے کے اولین علمبرداروں میں سجاد ظہیر سر فہرست رہیں گے۔ مجنوں گورکھپوری ترقی پسند تحریک کے ایک اور اہم سرخیلوں میں سے ایک تھے آپ نے ترقی پسند ادب کے نقوش کی وضاحت کے لیے معتدد مضامین تحریر کیے۔ آپ بنیادی طور پر رومانوی تحریک سے سفر کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔

مجنوں گورکھپوری نے "ادب اور زندگی"، "ادب کی جدلیاتی مادیت" ،"نیاادب کیا ہے" ادب اور ترقی" "ادب اور مقصد"، تاریخ اور تخلیق جیسے مضامین فلسفیانہ انداز میں تحریر کیے۔ بالخصوص ان کی کتاب ادب اور زندگی ترقی پسند ادب میں ایک وقیع اضافہ تھی۔ مجنوں گورکھپوری زندگی سماج اور

ادب کے تعلق کو مارکسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ادب اور زندگی میں وہ ادب اور زندگی کے تعلق پر سوال اٹھا کر اس کا جواب دیتے ہیں۔

> "مجھے صرف ایک سوال کو اٹھانا ہے اور اسی پر بحث کرنا ہے۔ یعنی ادب کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا۔ اور ادب ترک یا نپسیا کی پیداوار نہیں ہے ادب بھی اسی طرح ایک مخصوس اجتماعی ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے جس طرح کوئی دوسرا فرد اور ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات و سکنات۔"(۲۰)

ادب اور زندگی میں مجنوں گورکھپوری نے ادب اور زندگی کے تعلق ادب اور حسن پسندی، فن کاری ادب اور ترقی مقصد ادب جیسے موضوعات کو عمرانی انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے ادب کے وجدانی تصور کے بجائے سماجی تصور کو بنیاد بنایا انھوں نے اپنی تحریروں میں مارکسی جدلیاتی انداز کو بنیادی فکر کے طور پر پیش کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

> "ہم نے مارکس کا مطالعہ کیا اور دوسرے کئی انقلابی مفکروں کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہم ان کے افکار و خیالات سے ابتدا سے ہی متاثر تھے اور ہم نے دونوں کا بھرپور مطالعہ کیا تو بے اختیار ان کی آواز پر لبیک کہنے کو جی چاہا۔ تو ہم نے ان کا اثر قبول کیا اور یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نوجوان ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ ڈاکٹر اختر رائے پوری کے بعد میں نے ہی سب سے زیادہ انقلاب اور تاریخی تصور کی بنیاد پر زندگی اور ادب سے بحث کی اور ان کی تاریخی سمت متعین کی۔"(۲۱)

مجنوں گورکھپوری نے اپنی کتاب "ادب اور زندگی "میں ترقی پسند ادب کے نقوش اور واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ جنہیں اختر حسین رائے پوری اور بعد ازاں تقریباً دیگر تمام ترقی پسند ادیبوں نے کیا تھا اس لئے مجنوں گورکھپوری ادب کو ادب کی ماہیت اور کیفیت میں سمو کر ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں وہ ادب کو انسان کے حال کا ترجمان اور مستقبل کا اشاریہ قرار دیتے ہیں۔

> "ادب اگر زندگی کی تنقید ہے تو محض حال ہی پر اکتفا نہیں کر سکتا تنقید کا مقصد ہمیشہ ایک استقبالی میلان (Prospective Attitude) کی ضرورت ہوئی ہے۔ جس کا دوسرا نام تخیل ہے مختصر یہ کہ کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا

اشاریہ ہو۔ جس میں واقعی تخلیت افادیت جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہو۔ جس میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائے۔ جو ہمارے ذوق حسن اور زوق عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔"(۲۲)

مجنوں گورکپوری ادب میں زندگی کے سماجی مسائل اور ادبیت میں توازن کے قائل ہیں۔ ان کی تمام تحریروں میں بہر حال ایک ادبی شان بر قرار رہتی ہے جو انہیں دیگر ترقی پسندوں سے ممیز کرتی ہے اس لئے ان کی ترقی پسندی محض نعرے بازی اور سیاست کی زور آوری کی محتاج نہیں ہے بلکہ اس میں ایک ادبی وقار موجود ہوتا ہے مگر اس ادبیت کے باوجود وہ خالص ادب پرستی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ایسی سطحی ادبیت کے خلاف تھے۔ جس کی رو میں زندگی کے نشیب و فراز ہی کہیں کھو جائیں۔ اس لئے مجنوں ادب کو ایک خاص تہذیبی اور مادی حالات کی پیداوار تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادب ان خیالات اور احساسات کے اظہار کا نام ہے جو ایک خاص تہذیبی ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا وہ مزید لکھتے ہیں۔

"ادب انسان کے بہترین خیالات اور جذبات کے اظہار کا نام ہے انسان کے جذبات و خیالات خلا میں نہیں پیدا ہوتے بلکہ ایک خاص تہذیب اور ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔"(۲۳)

مجنوں گورکھپوری کے نظریات کے مطابق ادب ایک سماجی عمل ہے ادب اور زندگی سائے کی طرح ساتھ چلتے ہیں۔ ادیب جوگی یا سادھو نہیں ہوتا کہ وہ اپنے خارج اور ارد گرد کے واقعات سے لاتعلق اور بیگانہ ہو جائے بلکہ ادیب ایک سماج کا لازمی حصہ ہے۔ اس لئے ادب ایک خاص سماجی عمل کا نام ہے۔ یہ وہ ترقی پسند بیانیہ تھا جس کی نوک پلک اول تو اختر حسین رائے پوری نے سنواری بعد ازاں اس کو مجنوں گورکھپوری سجاد ظہیر، احتشام حسین، عبدالعلیم، ممتاز حسین، عبادت بریلوی، فیض احمد فیض، سید وقار عظیم جیسے جو ئندگان ادب میں اسے اپنے فن پارو میں بھی اور زیادہ وسعت دی۔ ترقی پسند ادب کے ان نمائندوں نے ادب زندگی اور سماج کے مادی تعلق کی اپنے اپنے انداز میں تعبیر و تشریح کی اختر حسین رائے پوری نے ادب کے ترقی پسند بیانے کی تشکیل کو اساس فراہم کی۔ ان کا مقالہ ادب اور زندگی ترقی پسند ادب کا مستند حوالہ ہے۔ انھوں نے ادب کو محض تلاش حسن کا اظہار قرار دینے کے بجائے زندگی کا ایک شعبہ قرار دیا۔

سجاد ظہیر نے ادب کو پیداواری رشتوں، مادی حالات اور ذرائع پیداوار کے ذریعے سمجھنے پر زور دیتے ہوئے خالصتاً مارکسی بیانیے کو ترقی پسند ادب کے رنگ میں پیش کیا۔ مجنوں گورکھپوری نے ادب کو ایک خاص تہذیبی عمل کی

پیداوار قرار دیا۔ وہ ادب کے افادی پہلو کے ساتھ ساتھ ادب کی روح کے لیے ادبیت کے قائل بھی تھے۔ اس لیے ان کے ہاں شائستگی اور لطافت کا ایک پہلو بہر طور موجود رہتا ہے احتشام حسین کے ہاں ادب اور زندگی کی بحث تاریخی معاشی اور ثقافتی پہلوؤں کی متقاضی رہتی ہے۔ وہ ادب کے مقصد کے بجائے ایک ذریعہ قرار رد یتے ہیں۔ اسی ذریعے یا توسل کے توسط سے ایک ادیب اپنے شعور کو سماج میں منتقل کرتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس احتشام حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "احتشام حسین کی تنقیدی فکر کا محور ہمیشہ مارکسی فلسفہ حیات رہا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ادب زندگی سے بیگانہ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس کو سماج کا آئینہ بننا ضروری ہے۔ احتشام حسین اپنی تنقیدوں میں دلائل و براہین اور نظم و ضبط کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ (۲۴)"

ڈاکٹر عبدالعلیم اور ممتاز حسین نے اپنی علمی کاوشوں سے ترقی پسند ادب کی نوک پلک کو سنوارا۔ ان کا نظریہ ادب بھی دیگر ترقی پسند ادیبوں سے مختلف نہیں تھا۔ بالخصوص ممتاز حسین نے ترقی پسند ادب، عوامی ادب اور مارکسی تنقید کا نظریہ جیسے مضامین لکھ کر ترقی پسند بیانے کی اساس کو اور زیادہ مضبوط معیار فراہم کیا۔ جبکہ ظہیر کاشمیری نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ادب کے مادی نظریے" میں ادب اور سماج کے گہرے مادی تعلق کو دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کی کاوش کی۔

ظہیر کاشمیری کے مضامین "لینن اور لٹریچر" اور "مارکس کا نظریہ ادب" منفرد نوعیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے ادب کی داخلی اور خارجی کیفیات کا موازنہ کرتے ہوئے ایک تصور پسند ادیب اور جذباتی مادیت کے پیروکار ادیب کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ لینن کے ایک قول کی مدد سے اس بات کی تشریح یوں کرتے ہیں۔

> "رجعت پسند ادیب داخلی کیفیات اور نفسیاتی الجھنوں کو ادب کی اساس قرار دیتے ہیں اور اس کے خارجی محرکات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس میکانکی مادہ پرست ادب کے خارجی محرکات کا تجزیہ تو کرتے ہیں۔ لیکن مصنف کے داخلی محرکات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔۔۔ جدلیاتی مادیت میں یقین رکھنے والے ادیب اصولی طور پر ان دونوں گروہوں سے مختلف ہیں۔ ان کے نزدیک داخلی کیفیات اور ان کے خارجی محرکات ادب کی دو ناگزیر بنیادیں ہیں"۔ (۲۵)

علی سردار جعفری ادب کے ترقی پسند نقطہ نظر میں ظہیر کاشمیری کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ مگر علی سردار جعفری ادیب کو کسی جماعت کے زیر اثر ادب تخلیق کرنے کے مخالف ہیں۔ وہ ایک ادیب کے شعور کو تاریخ اور ماحول سے الگ قرار دیتے ہیں۔ وہ ذوق جمال اور فن کے قومی اور طبقاتی کردار کو یکساں قرار دیتے ہیں۔ وہ جمالیاتی ذوق کو خالی وجدان، داخلی یا انفرادی چیزیں سمجھتے اور ایسے ادیبوں کو عینیت پرست اور رجعت پرست تصور کرتے ہیں۔ وہ آرٹ، ادب، سائنس جمالیات کے تعلق پر لکھتے ہیں:

> "جمالیات جسے الہامی اور وجدانی چیز سمجھا جا سکتا ہے، آرٹ اور ادب کی سائنس ہے جس پر ادب اور سماج، ادیب اور عوام کے باہمی رشتے کا تعین اور صورت و معنی کے مختلف مسائل حل کرنے اور بہتر سے بہتر ادب تخلیق کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔"(۲۶)

ترقی پسند ادب کے تشکیلی بیانیے میں اس کے علاوہ اختر انصاری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، فیض احمد فیض، عارف عبدالمتین، عابد حسن منٹو اور محمد حسن کا نام شامل ہے۔ ان سب ترقی پسند ادیبوں نے انفرادی حیثیت میں ترقی پسند بیانیے میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کیا۔ اختر انصاری نے ادب کی مقصدیت کو افادی ادب کی اصطلاح سے اور زیادہ وسعت بخشی تو فیض احمد فیض نے جدلیاتی انداز فکر میں جدلیاتی اسلوب کی آمیزش کر کے اسے نئے پیراہن عطا کیے۔ فیض کے بیانیے میں ایک دھیما پن اور اعتدال ہے وہ ترقی پسند ادب کی صداقت تو تسلیم کرتے ہیں مگر ان کا انداز اور اسلوب سخت گیر اور کٹھور نہیں ہے:

> "فیض نظریاتی برتری ثابت کرنے کے لیے حقائق کو مسخ نہیں کرتے بلکہ تنقید کو تاریخی صداقت سے متصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید کا داخلی مزاج خاصہ خشک ہے اور یہ قاری کو مستقل کرنے کی بجائے سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔"۔(۲۷)

سید وقار عظیم نے ادب کی مقصدیت پر زور دیتے ہوئے ادیب کے لیے حقیقت پسندی کو لازمی قرار دیا۔ انھوں نے ادب میں عمرانی اور سماجی عناصر کو موضوع بنایا جبکہ عبادت بریلوی ترقی پسند ادیبوں میں اس لحاظ سے قدرے مختلف انداز اپنایا انھوں نے حقیقت نگاری کو لازمی طور پر ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے سائنسی انداز اختیار تو کیا مگر اسلوب بہر طور جمالیاتی رکھا۔ انور سدید کے بقول:

"ڈاکٹر عبادت بریلوی کا طریق عمل سائنسی، انداز منطقی اور اسلوب جمالیاتی ہے اور وہ قاری پر یورش کرنے کے بجائے اسے ادب پارے کی افادیت اور داخلی حسن کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔"(۲۸)

یہ وہ ادیب تھے جنھوں نے ترقی پسند ادب کے اساسی بیانیے کو تشکیل دیا کہ آئندہ آنے والے وقتوں میں نئے ادب کی پہچان کیا ہے اور ادب کیا بالکل الگ سے وجود رکھتا ہے یا اس کا سماج کی تشکیل میں کوئی کردار ہوتا ہے۔ اس تحریک سے قبل ادب کو محض داخلی جذبات کا محرک سمجھا جاتا تھا۔ اب ادبی حلقوں اور دبستانوں میں ادب کے کردار اور مقصد پر اس کے حق اور مخالفت میں بہت کچھ تحریر ہونے لگا۔ نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے ترقی پسند ادب کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو اس سے قبل شاید ہی کسی رجحان یا تحریک کو حاصل ہوئی ہو۔ شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، تنقید سمیت ہر ہیئت اور اصناف پر ترقی پسند تحریک نے ان مٹ نقوش مرتب کیے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھیے اس رجحان نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی اور مکمل دبستان کی حیثیت سے ظہور پذیر ہو گیا۔

جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند بیانیے کی تحت تشکیل پانے والے موضوعات کے تناظر میں اردو شاعری کو خوب وسعت بخشی۔ اس ابتدائی دور کی شاعری میں طبقاتی کشمکش، سامراج دشمنی، غربت، استحصال، جبر، آمریت، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، ننگ اور افلاس جیسے موضوعات کے ذریعے سماجی مسائل کی نمائندگی کی اور طبقاتی اور سماجی شعور کے تحت آزادی انصاف، انقلاب، بغاوت، احتجاج، مزاحمت، مساوات، جمہوریت کا نعرہ بلند کیا گیا۔ شاعری سے روایتی فرسودگی کا قلع قمع کرتے ہوئے سائنسی اسلوب فکر کو جگہ دی گئی۔ ترقی پسند تحریک کا یہ دور عروج کا دور تھا۔ اس دور میں تحریک نے خوب ترقی کی۔ ادب کے دامن کو نئے موضوعات، خیالات، اصناف سے مالامال کیا۔ سماجی حقیقت نگاری کے تحت معاشرتی مسائل کو وسیع پیمانے پر ادب میں جگہ ملی۔

نظریے کی ترسیل چوں کہ بنیادی مقصد تھا تو سوشلسٹ حقیقت نگاری کے تحت "مزدور" نئے ادب کا ہیرو قرار پایا۔ سوشلسٹ حقیقت نگاری کے تحت انسانی عظمت کے گیت گائے اور سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو سختی کے ساتھ رد کیا گیا۔ اس شدید نظریاتی یلغار میں کہیں کہیں جمالیاتی احساس کھویا ہوا نظر آیا تو اس کمی کو فیض کی انقلابی رومانیت نے پورا کیا۔

۱۹۳۵ء سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ترقی پسند ادب کے شعرا کے عمومی موضوعات وہی تھے جو ترقی پسند تحریک کے مقاصد میں طے تھے مگر تقسیم ہندوستان کے بعد ترقی پسند تحریک بھی اب دو حصوں میں مقسم ہو چکی

تھی۔ ملکی تقسیم سے پھوٹنے والے فسادات اور ہجرت سے پیدا ہونے والے انسانی المیوں سے ہر ترقی پسند ادیب آزردہ تھا۔ اس منظر نامے میں اردو شاعری کے نئے موضوعات کو شامل کیا۔ ڈاکٹر محمد صادق ترقی پسند ادب کے اس دور کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اس خون ریزی اور افراتفری کے خوف ناک منظر نامے نے ادب اور شاعری پر بہت گہرے اور ان مٹ اثرات چھوڑے ان حالات وواقعات کا خوف ناک منظر ملک کے دانشوروں کی نظروں نے دیکھا۔۔۔ شاعروں اور ادیبوں نے ان پر آشوب حوادث پر اظہار خیال شروع کیا اور اس منظر نامے کو اپنا موضوع بنایا۔"(۲۹)

تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کے پیش نظر پاکستان میں ترقی پسند ادب کی نوعیت کے حوالے سے جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں طے پایا گیا امن، آزادی، جمہوریت اور اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے کام کیا جائے اردو کو تعلیم کے فروغ کا ذریعہ بنانے پر بات ہوئی۔ تہذیبی اور تعلیمی مہم کے ذریعے ہندوستان اور پاکستان میں تہذیبی اشتراک قائم کرنے پر زور دیا گیا۔ ہجرت کر کے پاکستان میں مقیم پناہ گزینوں کے مسئلے کے حل اور جاگیر داری نظام کے خاتمے پر زور دیا گیا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان کی نوزائیدہ ریاست میں ترقی پسند تحریک کے لیے کافی مشکلات کھڑی ہو گئیں۔ ادیبوں اور مصنفین کی ایک بڑی تعداد اس تحریک سے علیحدگی کا اعلان کر گئی اور تحریک کے نمائندہ رسائل ادب لطیف، نقوش اور سویرا پر حکومت نے پابندی عائد کر دی۔ اس کے علاوہ غیر ترقی پسند ادیبوں سے قطع تعلقی اور معاذ آرائی کا بھی تحریک کو نقصان ہوا۔ حکومتی اور سیاسی حلقوں میں اس تحریک کے لیے پہلے ہی کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ اب صورتحال مزید خراب ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ زبان کے مسئلے پر ترقی پسندوں کے موقف نے حکومتی حلقوں میں ان کے خلاف اور زیادہ نفرت پیدا ہو گئی۔ ادب اور سیاست کے علاوہ ادب اور مذہب پر بحثوں کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں ترقی پسند تحریک کے خلاف حالات مزید خراب ہوتے رہے۔ اور بالآخر جب حکومت نے راولپنڈی سازش کیس کے بعد کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر پابندی لگائی تو نتیجتاً انجمن ترقی پسند مصنفین کو بھی اس پابندی کا سامنا کرنا۔ اس پابندی سے تحریک کو سخت نقصان ہوا:

> "ترقی پسند تحریک نے اچھا ادب تخلیق کرنے کے بجائے سیاست کا دھارا موڑنے کی کوشش کی اور حکومت کے احتساب نے اس کا شیرازہ منتشر کر دیا۔۔۔ چنانچہ یہ تحریک نہ صرف اپنے رفقا کی بے عملی کی وجہ سے انتشار کا شکار ہو گئی بلکہ ترقی پسند نظریے کی عدم تفہیم نئے حالات کے غلط تجزیے اور غیر متوازن سیاسی فیصلوں نے بھی اس تحریک کو ختم کرنے میں معانت کی۔"(۳۰)

تحریکی سطح پر یہ ترقی پسند تحریک کا پاکستان میں اختتام تھا۔ یہ ترقی پسند ادب کے لیے ایک دھچکا تھا۔ تحریک پر پابندی کے بعد اگرچہ اجتماعی نوعیت سے ادب کی تخلیق کمزور پڑی تھی مگر اس کے باوجود انفرادی طور پر ترقی پسند بیانیے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تحریک کے باقاعدہ خاتمے کے بعد بھی اس کے اثرات سے تقریباً ہر ادیب متاثر رہا۔ مارشل لا کے دور میں جمہوریت کی بحالی کے لیے ادب تخلیق ہوا۔ یہ ایک نیا شعور تھا جس کا بیج ترقی پسند تحریک نے بویا تھا۔ فیض، احسان دانش، ظہیر کاشمیری، حبیب جالب، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین کے علاوہ رضا ہمدانی، فارغ بخاری، مجروح سلطان پوری، علی جواز زیدی، احمد ریاض نے اس دورانیے میں ترقی پسند موضوعات کو شاعری کے ذریعے اجاگر کیا۔ اب بظاہر تو پچاس کے عشرے میں تحریک کا باقاعدہ اختتام ہو چکا تھا مگر ادب برائے زندگی کے جس تصور کو ترقی پسند تحریک نے پیش کیا تھا۔ اس فکر نے آنے والی کئی دہائیوں تک شاعروں اور ادیبوں کو متاثر کیے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے باقاعدہ خاتمے کے بعد بھی آج تک ترقی پسند فکر کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ اور اس کے بعد آج تک شعرا اور ادبا نے انفرادی سطح پر اس بیانیے کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ اس لیے ترقی پسند تحریک کے ختم ہونے سے یہ ادبی بیانیہ ختم نہیں ہو سکا بلکہ آج تک زندہ ہے اور نئے انداز میں فکری در واکر رہا ہے۔ اس لیے آج کی جتنی بھی ترقی پسند شاعری ہے وہ اسی تحریک کی توسیع ہی ہے احمد پراچہ کے بقول:

> "فیض، ندیم، مخدوم، مجاز جانثار اختر، اختر الایمان اور کیفی اعظمی کی فکر کا تسلسل آج بھی موجود ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت موجودہ دور میں بات کہنے کے قرینے تبدیل ہو گئے ہیں۔ لہجہ بدلا ہوا لفظیات کسی حد تک مختلف اور معروضیت زیادہ نمایاں دکھائی دینے لگی ہیں۔"(۳۱)

اس لیے آج کے دور میں بھی ترقی پسند ادب اپنے اندر جدید دور کے مسائل اور موضوعات کو نئے پیراہن عطا کر رہا ہے یہ سفر جاری ہے اور آنے والے وقتوں میں معروضی حالات کے مطابق ڈھالتے ہوئے ہر دور کے مطابقت میں ادب کو تخلیق کرتا رہے گا۔ ترقی پسند تحریک کے خاتمے کے باوجود ترقی پسند ادب سے وابستہ، ادیبوں اور شاعروں نے اپنے دور کی تہذیبی، تاریخی، ادبی اور معاشرتی روایات کو ادب کا موضوع بنایا وہ اس سے کسی طور بیگانہ نہ ہو سکے۔ اس لیے بعد میں آنے والے شاعر ان تلخ حقائق کو آج کے زمانے کی نیو لبرل اکانومی سے پیدا ہونے والے معاشی مسائل، شیفٹوں میں منقسم جدید مزدور اور مشینی تسلط کو نئے پیرایہ اظہار کی ضرورت تھی۔ اس پیرایہ اظہار کو ترقی پسند ادب کی روایت سے جڑے شعرا نے زبان بخشی اور اپنے معروضی حالات وواقعات کے مطابق ادب میں سماجی مسائل کو بیان کیا:

"آج کا ترقی پسند ادیب اپنی تہذیبی ،ادبی اور تاریخی روایات سے بیگانہ نہیں۔۔۔ساری دنیا میں آج مزاحمتی شاعری ترقی پسند شاعری ہی کی توسیع ہے۔یوں دیکھا جائے تو اب دنیا کو مذہبی جنونیت،فرقہ پرستی،شدت پسندی،ہوس ملک گیری،اور بڑی طاقتوں کے دوسری اور تیسری دنیا کے مادی وسائل پر مکمل اختیار حاصل کرنے جیسے مسائل کا سامنا اس شدت پسندی کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔"(۳۲)

یہ مطالبہ درست ہے کیوں کہ ایک ادیب ہی کسی سماج کا حقیقی ضامن اور خیر خواہ ہوتا ہے۔اس لیے اس کا قلم اس کے ضمیر کی آواز کا آلہ ہونا چاہیے۔ترقی پسند ادب کی تحریک سے منسلک ادیبوں نے ہر بدلتے دور کے مسائل کو ادب میں جگہ دی۔ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے شدید طبقاتی استحصال سے پیدا ہونے والی بھوک پسماندگی اور تیسری دنیا کے ممالک میں غربت، بھوک پیاس بے روزگاری اور نظام کے جبر سے تنگ ہو کر خودکشیوں کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے ادبی موضوعات میں جگہ بنائی۔اس کے علاوہ تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے نتیجے میں دنیا میں جو ہری ہتھیاروں کی دوڑ اور اس سے پیدا ہونے والی عالمی جنگ کے امکانات ،کمرشل تجارتی اجارہ داری، ہتھیاروں کی بے تحاشا فروخت، سامراجی جارجیت، مذہبی انتہا پسندی اور ملٹائی نیشنز کمپنیوں کے استحصال نے اہل قلم کے لیے نئے ادبی موضوعات کی راہ ہموار کی ہے۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ آج کے ادیب ان حالات سے بیگانہ نہیں ہیں۔انھوں نے ان بدلتے ہوئے سماجی سیاسی معروضی تقاضوں اور حالات کے مطابق ترقی پسند ادب کی مستقل کو جلائے رکھا۔جن کی بہترین مثال تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن ہیں۔

تنویر سپرا:

جہلم کے ایک مزدور گھرانے میں ۱۹۲۹ء میں جنم لینے والے محمد حیات جنھوں نے تنویر سپرا کے ادبی نام سے پہچان قائم کی۔اردو ادب کے معروف ترقی پسند شاعر ہیں۔ مفلسی اور ننگ کے باعث بچپن سے ہی مزدوری کے پیشے سے منسلک ہوئے۔ مختلف کمپنیوں میں مزدور کی حیثیت سے کام کیا۔غربت کی وجہ سے رسمی تعلیم کو نہ حاصل کر پائے مگر مطالعے کے شوق کی وجہ سے غیر رسمی تعلیم کو جاری رکھا۔

تقسیم ہند کے فسادات کو بچپن میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لڑکپن میں تلاش روزگار میں کراچی چلے گئے۔ایک بحری بیڑے پر رنگ وروغن کا کام کیا۔بعد ازاں اپنی دکان کھولی۔اس کے علاوہ جہلم میں ایک تمبا کو کمپنی

میں بھی کام کیا اور لاہور میں صحافت کے شعبے سے بھی منسلک رہے۔ تنویر سپرا نے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۳ء کو رشید آباد، جہلم میں وفات پائی۔

تنویر سپرا کی شاعری کی واحد کتاب "لفظ کھردرے" ہے جو ۱۹۸۰ء میں منصہ شہود پر آئی۔ سپرا کی شاعری کا آغاز ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ہوا۔ ایوبی آمریت کے خلاف بھرپور کردار ادا کیا۔ مزدور تحریکوں سے وابستہ رہے۔ عملی اور نظریاتی سیاست میں بھرپور حصہ لیا۔ جنرل ایوب خان اور ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف جمہوری تحریکوں کے سرگرم رکن رہے۔ ایم۔ آر۔ ڈی میں بھی شامل رہے۔ اپنی انقلابی شاعری کی وجہ سے کئی مقدمات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ایک مزدور شاعر ہونے کی وجہ سے تنویر سپرا نے شاعری میں عوامی مسائل اور مزدور طبقے کے استحصال کو اپنی شاعری کے موضوعات میں جگہ دی ہے۔ تنویر سپرا ایک حقیقی ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کے شاعری کے ترقی پسند بیانیے کے موضوعات کو جدید انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی ان کی کتاب کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

> "سپرا ایک غیر مبہم نقطہ نظر ایک اعلانیہ وابستگی کا شاعر ہے۔ بعض عناصر ایسے شعرا کو "پروپیگنڈسٹ" کہتے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ وہ تنویر سپرا کے کلام کا بے تعصبی سے مطالعہ کریں وہ ایسا کریں گے تو انہیں معلوم ہو گا کہ مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں پروپیگنڈے کو فن سے اور فن کو پروپیگنڈے سے الگ کرنا ناخن کو گوشت سے جدا کرنے کے مترادف ہو جاتا ہے اور خود تنویر سپرا کا کلام اس کا شاہد ہے۔"(۳۳)

زندگی کے تلخ تجربات جو نئے مشینی عہد میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا ہو رہے ہیں سپرا کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں مقالے میں تنویر سپرا کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ترقی پسند عناصر کی نشاندہی کی جائے گی۔

## اقبال ساجد:

ترقی پسند تحریک کے خاتمے کے بعد انفرادی سطح پر اس تحریک کے ادب کو زندہ رکھنے والے حوالوں میں ایک اور نام اقبال ساجد کا ہے۔ اقبال ساجد ۱۹۳۲ء میں اتر پردیش ضلع سہارنپور کے علاقے لنڈھوار میں تولد ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور منتقل ہوئے اور تا عمر وہیں مقیم رہے۔ ریڈیو پاکستام سے منسلک رہے۔ اس کے علاوہ کالم نگاری بھی کرتے رہے۔ ساری زندگی تنگی غربت اور بدحالی کے باوجود اپنی حمیت اور خودی کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان کی شاعری میں سماجی اور معاشی استحصال اور جبر کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں معاشی ابتلا سے پیدا ہونے والے مسائل کے خلاف غم وغصے کا اظہار پایا جاتا ہے۔ ان کے شعروں میں جابجا طبقاتی تفریق کے خلاف غم و

غصے کا اظہار ملتا اور وہ ایسے طبقاتی استحصالی سامراجی نظام کو ملیامیٹ کرنے کی خواہش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جواز جعفری ان کی اس خواہش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "چنانچہ ایک ایسا سسٹم جو پوری تیسری دنیا پر مسلط کر دیا گیا ہے جو نظام انسانی امنگوں کا دشمن ہو، جو انسان کی آزادی، مساوات، عزت نفس، انصاف اور محنت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہو ساجد اسے ملیامیٹ کر دینے کی بات کرتا ہے۔"۔(۳۴)

اقبال ساجد کی شاعری جس نظام زر کے خلاف جدوجہد اور غم غصہ نظر آتا ہے۔ اس نظام حیات نے کئی نابغہ روزگار فن کاروں پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اقبال ساجد کی زندگی بھی اس غربت کے ہاتھوں تضاد کا شکار ہوئی۔ وہ حالات کے شدید دباؤ اور جبر کے نتیجے میں ساغر صدیقی کی طرح کچھ نامناسب سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے۔ مگر یہ سب کچھ ان تلخ سماجی عوامل کا ردعمل تھا جس کا سامنا وہ زندگی بھر کرتے رہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں بھی ایک ایسے نظام حیات کے خلاف نفرت ملتی ہے جو انسان سے انسان ہونے کا جواز چھین لیتا ہے۔ اقبال ساجد کی شاعری میں بھوک، غربت، محنت کے استحصال، معاشی و معاشرتی طبقاتی تفریق اور ناہمواری جیسے عوامی اور ترقی پسند موضوعات کا ذکر ملتا ہے۔ اقبال ساجد کی شاعری جدید دور کے مسائل نئے اسلوب کے تحت پیش کیا گیا۔ مقالے میں اقبال ساجد کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے دور کے اہم ترقی پسند شعرا تنویر سپرا اور یوسف حسن کی شاعری سے تقابل بھی کیا جائے گا۔ اور دیکھا جائے گا کہ اقبال ساجد کی شاعری نئے دور کے ترقی پسند بیانیے کو اپنے اندر سمونے میں کس حد تک کامیاب رہی۔

یوسف حسن:

ترقی پسند تحریک کے فکری تناظر تحریک کے خاتمے سے ختم نہیں ہو تا بلکہ یہ فکری رجحان آج کے زمانے کی مطابقت میں جاری و ساری ہے۔ ترقی پسند فکر کے ایسے نئے رجحان کے نقوش واضح کرنے والوں میں ایک اہم نام یوسف حسن کا ہے۔ یوسف حسن جدید دور کے اہم فکری رجحان سازوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند فکر کو وقت کے تقاضوں کے نہ صرف ہم آہنگ کیا بلکہ ترقی پسند فکر کی نئی سمتیں اور جہات بھی متعارف کروائیں۔ یوسف حسن کی شاعری کی کتاب "اے دل اے دریا" کے نام سے ان کے انتقال کے بعد منصہ شہود پر آئی۔ یوسف حسن روایتی ترقی پسند فکر کے شاعر نہیں بلکہ ان کی شاعری ایک مسلسل ارتقا اور عصری زندگی سے مکمل ہم آہنگی اور مطابقت کا نام ہے۔

TH-27122

یوسف حسن کی شاعری ترقی پسند فکر کی جدید عصری تعبیر ہے۔ ان کی ترقی پسندی کا جوہر مارکسزم ہے۔ اس لیے یوسف حسن کی شاعری طبقاتی و سماجی شعور کے ساتھ ساتھ سماجی و پیداواری عمل کے متشکل ہوتی ہے۔ یوسف حسن جدید دور میں ترقی پسند سے منسلک ایک اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند فکر کی خالصتاً مطالعے اور سائنسی شعور کی بنیاد پر اپنایا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پھر اس نظریے کے ساتھ تادم آخر منسلک رہے۔ اپنے پختہ سماجی اور طبقاتی شعور بنیاد پر ان کی نظری دائرہ کار بہت وسیع ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس وسیع تر فکری دائرہ کار کا اثر ان کی شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اپنے اولین دور میں جن فکری زاویوں کا متعارف کروایا ان زاویوں کی روشنی میں شعرا نے ادب کا سماج سے رشتہ اور بھی مضبوط کر دیا۔ ہر شاعری نے اپنے اپنے ماحول اور گردونواح میں پائے جانے والے انسانی مسائل کو شاعری کے ذریعے اجاگر کیا۔ ادب زندگی کا ترجمان بنا۔ ادب اور سماج کا تعلق مضبوط ہوا۔ عصری مسائل کو ادب کے ذریعے پیش کیا گیا۔ ایک ترقی پسند ادب کی یہ بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کو محسوس کرے۔ یوسف حسن کی شاعری کی بنیادی خصوصیت بھی یہی ہے کہ وہ اپنے سماج اور ماحول سے جڑی ہوئی۔ ان کی شاعری میں موجودہ طرز معاشرت کے مسائل کو نئے اسلوب کے ساتھ پیش کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ یوسف حسن کی شاعری میں طبقاتی طرز معاشرت سے پیدا ہونے والے سماجی عوامل کو برتنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ قدروں، منڈی کی معیشت اجارہ داری، جبر اور استحصال کے ساتھ ساتھ انسانی اور سماجی رشتوں کا گہرا شعور بھی ملتا ہے۔

یوسف حسن کی شاعری ترقی پسند فکر کا عصری بیانیہ ہے۔ انھوں نے جدید دور میں اس فکری تناظر کو ایک منفرد اور نئے روپ میں برتا ہے۔ خالصتاً مارکسی ترقی پسند تناظر رکھنے کی وجہ سے ان کی شاعری میں بھی جدید معاشی مسائل کی پیش کش ملتی ہے۔ نیو لبرل اکانومی، سامراجی یلغار، استحصالی پیداواری رشتوں کو مارکسی جمالیات کے استعاروں کے ساتھ پیش کرنا ان کی ترقی پسندی کا منفرد آہنگ ہے۔ یوسف حسن کی شاعری نہ صرف جدید ترقی پسند فکری تناظر قائم کرتی ہے بلکہ وہ عصری زندگی کے مسائل کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف حسن اپنے ہم عصر ترقی پسند شعرا میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ مقالے کے آئندہ ابواب میں یوسف حسن کی شاعری کا ترقی پسند فکر کے تناظر میں مطالعہ کرتے ہوئے ان کے ہم عصر شعرا (منتخب) سے تقابل کیا جائے گا۔

مجموعی طور پر تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کا شمار اہم ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ تینوں شعرا کے ہاں ترقی پسند عناصر ملتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے بحرانی دور کے بعد اس تحریک کو نئے فکری تناظر میں پیش کرنے

والوں میں بلاشبہ تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کا نام شامل ہے۔ مقالے میں تینوں شعرا کی شاعری کا ترقی پسند فکر کے تناظر میں تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے تقابل کیا جائے گا۔

# حوالہ جات


۱۔ رائے پوری، اختر حسین۔ادب اور انقلاب (حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳)، ۸ ۔

۲۔ سدید، انور۔اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ ) ۴۳۳۔

۳۔ ظہیر، سجاد۔ روشنائی (لاہور: پرائم ٹائم پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ ) ص ۲۰۔

۴۔ رائے پوری، اختر حسین۔ادب اور انقلاب (حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳)، ۴۴۹،۴۵۰۔

۵۔ ایضاً، ص ۴۶۵

۶۔ سدید، انور۔اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ ) ۴۷۷۔

۷۔ رائے پوری، اختر حسین۔ادب اور انقلاب (حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳ ) ۲۴، ۲۵۔

۸۔ ایضاً، ۴۵۴

۹۔ ایضاً، ۴۵۹

۱۰۔ نقوی، جمال۔ ترقی پسند تحریک کا سفر (لاہور پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ )، ۲۱

۱۱۔ سجاد ظہیر، کلیات سجاد ظہیر (مرتبہ نجمہ ظہیر، باقر علی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۶)، ۷۹

۱۲۔ نقوی، جمال۔ ترقی پسند تحریک کا سفر (لاہور: پیس پبلی کیشنز) ۲۰۱۸، ۲۳

۱۳۔ سجاد ظہیر، کلیات سجاد ظہیر، (مرتبہ نجمہ ظہیر، باقر علی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۶) ۸۲

۱۴۔ علی، احمد۔ترقی پسند تحریک کا پس منظر (کراچی: مکتبہ افکار، ۱۹۷۴) ۴۲

۱۵۔ سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ ) ۴۷۸

۱۶۔ ظہیر، سجاد۔مضامین سجاد ظہیر (لکھنؤ: اُردو اکادمی، س ن) ۳۷، ۳۸

۱۷۔ ظہیر، سجاد۔ روشنائی۔لاہور (پرائم ٹائم پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ ) ۱۴۸

۱۸۔ ایضاً، ۹۱

۱۹۔ محمد عقیل، سید۔ترقی پسند تحریک کی تنقیدی تاریخ (الہ آباد: ادارہ نیا سفر، ۲۰۰۹ ) ۵۰

۲۰۔ گورکھپوری، مجنوں۔ادب اور زندگی (گورکھپور: ایوان اشاعت، س۔ن) ۲۰۱

۲۱۔ لکھنوی، صہبا۔ رومانی، انجم۔ ارمغان مجنوں (کراچی: مجنوں اکیڈمی، س۔ن) ۲

۲۲۔ گورکھپوری، مجنوں۔ ادب اور زندگی (گورکھپور: ایوان اشاعت، س۔ن) ۲۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۲

۲۴۔ رئیس، قمر۔ترقی پسند ادب کے معمار (دہلی: نیا سفر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ ) ۸۷

۲۵۔ کاشمیری، ظہیر۔ادب کے مادی نظریے (لاہور: کمال پبلشرز، س ن) ۳۹

۲۶۔ جعفری، سردار۔ ترقی پسند ادب (لاہور: مکتبہ پاکستان، س۔ن) ۳۹

۲۷۔ سدید، انور۔اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ ) ۴۸۲

۲۸۔ ایضاً، ۴۸۲

۲۹۔ صادق، محمد۔ ترقی پسند اردو غزل کا آغاز و ارتقا (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۱۲ ) ۱۴۹

۳۰۔ سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ ) ۴۶

۳۱۔ پراچہ، احمد۔ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ ) ۲۸

۳۲۔ محمد علی عمیر، "نیو لبرلزم: وہ نظریہ جو تمام مسائل کی جڑ ہے"، تاریخ ملاحظہ ۳۰ اگست ۲۰۲۲ء، وقت شام چار بجے

Http://humsub.com/newlibrisim

۳۳۔ قاسمی، احمد ندیم۔صداقت کا شاعر مشمولہ تنویر سپرا اہل قلم کی نظر میں۔ (لاہور: شرکت پرینٹنگ پریس، ۱۹۹۴ ) ۲۰

۳۴۔ جعفری، جواز۔ اقبال ساجد ایک ناراض خو شاعر مشمولہ کلیات اقبال ساجد۔ (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴) ۱۹

# باب دوم

## سماجی مسائل کے تناظر میں منتخب شعرا کا مطالعہ: تجزیہ و تقابل

ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے لے آکر آج تک کے ترقی پسند شعرا نے سماجی مسائل کو اپنی شاعری میں سب سے زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ منشور تھا جو ترقی پسند تحریک کی بنیاد تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب میں پہلی مرتبہ سماج کے لفظ کو اجنبیت کے دائرے سے نکال کر قبول عام کے درجے پر لا کھڑا کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سماج اور سماج سے جڑے انسانی مسائل کو فوقیت ملنا شروع ہوئی۔ ترقی پسند تحریک کے اولین منشور اور بعد ازاں اس تحریک کے اثر نے ادیب کو سوچنے کے نئے زاویے متعارف کروائے۔ ادب، ادیب، انسان اور سماج اس نئی بحث کے موضوعات ٹھہرے۔ سماج اور سماجی مسائل کا یہ ادراک ایک دم ہی ادیب کو نہیں ہوا تھا۔ بنیادی طور پر ان معروضی اور مادی عوامل کا مظہر تھا۔ جو بالعموم صنعتی دور اور بالخصوص انیسویں اور بیسویں صدی کے اس عالمی منظر نامے اور تحریکوں کی وجہ سے عالم انسانیت محسوس کر رہی تھی۔ قدیم جاگیر داری عہد کی فیوڈل قدروں کا انہدام انسان کی انفرادیت پسندی کا سوال، جرمن فلسفے کا عروج، احیائے علوم، خرد افروزی، عقلیت پسندی کی وجہ سے صنعتی انقلاب یہ وہ تمام عوامل تھے جن کی وجہ سے یورپ کے اندر سب سے پہلے اور بعد ازاں ساری دنیا میں آمریت، بادشاہت، پاپائیت کے خلاف رد عمل پیدا ہوا اور بعد ازاں اس رد عمل کے بطن سے سوشلزم، جمہوریت سیکولرزم جیسے نظریات نے جنم لیا۔ مارکس نے سماجی پیداوار میں محنت کو بالا دست قرار دے کر سماجی مسائل سے پاک ایک مزدور اور انسان دوست سماج کا تصور فراہم کیا تو اس سے قبل روسو اور والٹئر نے آمریت اور جبر کے خلاف جمہور کی بالا دستی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے جمہوریت کا نعرہ بلند کیا۔ مذہبی پاپائیت کی وجہ سے ہونے والے استحصال اور سائنس دشمنی کے رویے کے خلاف مذہب کی اتھارٹی کو محدود کر کے انسان کو مرکز قرار دے دیا گیا۔

ان تینوں تحریکوں کے ساتھ ساتھ دیگر کئی تحریکوں نے بھی جنم لیا۔ اور انسانی سماج پر انمٹ نقوش مرتب کیے۔ سماج کے دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی ان تمام تحریکوں کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ مغرب کے ادیبوں نے اس اثر کو سب سے پہلے قبول کیا۔ مغرب کے علاوہ دیگر خطوں کے ادیبوں نے بھی اپنے مقامی شعور کو بروئے کار لایا اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ دیگر خطوں کے ادیب اس سماجی عمل سے بالکل بیگانہ تھے۔ برصغیر کے ادیب بھی اس سماجی عمل سے کٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ انھوں نے مغرب کے ان تہذیبی اثرات اور ترقی پسند نظریات کو قبول کیا۔ جمہوریت، اشتراکیت انسان دوستی اور خرد افروزی کو کثرت سے قبول کیا۔

بیسویں صدی میں دنیا حیرت انگیز تبدیلیوں سے گزری۔ سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت نے انسانی سماج کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انسان نے اس صدی میں دو عالمگیر خوفناک جنگیں بھی دیکھیں۔ جن کے نتیجے میں کروڑوں انسان لقمہ اجل بنے۔ ساری دنیا میں قحط اور بیماریوں سے لوگ سسک سسک کر مرنے لگے۔ ساری دنیا میں ان مسائل کی وجہ سے بے چینی بڑھ رہی تھی۔ سرمایہ داری نظام کے اس تضاد میں جہاں سائنسی

وصنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ زرعی انقلاب کی وجہ سے اشیائے خورد و نوش سمیت انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اشیائے ضروریہ کے انبار لگے ہوئے تھے تو وہیں دنیا کی دو تہائی آبادی بھوک، افلاس، ننگ، بیماری اور غربت کا شکار تھی۔

بیسویں صدی میں ساری دنیا کے ادیبوں نے سرمایہ داری نظام کے اس استحصال کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ سیاسی سطح پر دنیا میں برپا ہونے والے انقلابات اور تحریکوں نے اس آواز کو اور بھی زیادہ توانائی بخشی۔ برصغیر کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس آواز کے ساتھ اپنی آواز کو ملایا۔ بھوک، غربت، ننگ، افلاس، بیماری سمیت جدید سرمایہ داری اور سامراجی نظام سے پیدا ہونے والے مسائل مہنگائی، افراط زر، ظلم جبر، استحصال، آمریت، مشینی زندگی کی اکتاہٹ، اوور ٹائم اور شفٹوں میں منقسم مزدور کا استحصال، گلوبلائزیشن کے ذریعے تہذیبی انہدام اور شناخت کے بحران، احساس محرومی، منڈی کی معیشت، ہتھیاروں کی بے تحاشا تجارت، مذہبی انتہا پسندی، کارپوریٹ کلچر کا استحصال، نیو کالونیل ازم اور نسل پرستی کو ادیبوں اور شعرا نے بیان کیا۔ ترقی پسند شاعروں کے سماجی مسائل کی ادبی نوعیت کے حوالے سے ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں؛

> "تمام شعرا نے ہندوستان کے مسائل اس کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی بدحالی کو دیکھا اور ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے اپنی غزلوں میں ان کے مسائل کو پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ملک کو انگریزوں کی چال بازیوں سے نجات دلائی اور آزاد کرانے میں عوامی جدوجہد کی حمایت کی ہے۔ ترقی پسند غزل گو شعرا کے پیش نظر یہ تمام مثالیں موجود تھیں جو آگے چل کر ترقی پسند غزل کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئیں۔"(۱)

اردو ادب کے ترقی پسند شعرا نے اپنے اپنے دور کے سماجی مسائل کا احاطہ بہترین انداز میں کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز اس کے عروج اور اس تحریک کے مختلف ادوار میں مختلف قسم کے سماجی مسائل کو ادب کے پیرائے میں بیان کیا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی کہ ترقی پسند تحریک کا بنیادی سوال ہی سماجی مسائل پر تھا۔ انسانی سماج کو درپیش غربت، استحصال اور بھوک جیسے عالمگیر مسائل کا سامنا تھا اور سرمایہ داری نظام کے بطن سے پھوٹنے والے ان مسائل کو ترقی پسند شعرا نے ادبی پیراہن عطا کر کے عوام میں شعور اور آگہی کو بیدار کیا۔

ترقی پسند شعرا نے زندگی اور ادب کے تعلق کو نیا زاویہ بخشا۔ انسانی مسائل اور احتیاجات کو اجاگر کرنے کے لیے شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا گیا۔ انسان اور انسانی سماج کے مسائل کو ترقی پسند شعرا نے بھرپور اور جداگانہ

انداز میں اجاگر کیا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے لے کر اس تحریک پر پابندی کے باوجود اس تحریک کے اثرات اس قدر توانا تھے کہ بیسویں صدی میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کی شاعری میں ترقی پسند عناصر موجود نہ ہوں۔ اگرچہ ترقی پسندی اردو شاعری نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے مزاج اور انداز میں تبدیلیاں ضرور لائی مگر سیاسی اور سماجی مسائل سے اس کا رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ اس میں نئے رجحانات اور موضوعات شامل ہوئے۔ سیاسی بحران، سماجی ناہمواری، جاگیر داری اور سرمایہ داری نظام میں کچلے اور پسے ہوئے طبقات کی ترجمانی ہمیشہ سے ترقی پسند شعرا کا خاصہ رہی ہے۔ اس لیے آج کے دور میں بھی جب کہ ترقی پسند تحریک کو گزرے ایک طویل وقت ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود ترقی پسند شعرا آج بھی اسی طرح اپنا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ ترقی پسند تحریک ہی تھی جس نے ادب کو خالی جذباتیت اور بیمار رومانیت کے مقابلے میں انسان کے حقیقی سماجی مسائل کا ترجمان بنایا۔ بقول یعقوب یاور:

> "شاعری جو محض جذباتیت اور رومانیت کی گرفت میں تھی۔ اس نئے رجحان نے اسے اپنے گرد و پیش سے آشنا کیا اور اس کا تعلق امرا اور جاگیرداروں کی بجائے عوام الناس کے اس طبقے سے قائم کیا جو پوری طرح غلامی کے جبر اور استحصال کا شکار تھا۔ شاعری نے اس دبے کچلے مسائل کو اپنایا اور سرمایہ داری، ظلم، جبر، فاشیت اور توہمات وغیرہ کے خلاف آواز اٹھائی۔"(۲)

ترقی پسند تحریک نے سماجی مسائل کے تناظر میں جس شعور کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس شعور سے کئی شعرا نے آنے والے وقتوں کے ادب کو اپنے انداز میں ضیا بخشی۔ قیام پاکستان کے بعد جب ترقی پسند تحریک بحرانی دور سے گزری اور بعد ازاں اس پر باقاعدہ پابندی بھی لگ گئی تو اس تحریک کی آواز کو انفرادی طور پر شعرا نے زندہ و جاوید رکھا۔ جس کی واضح مثال تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن ہیں۔ ان شعرا نے اپنے اپنے اسلوب پیش نظر رکھتے ہوئے ترقی پسند شاعری کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ سماجی مسائل کو اپنی شاعری میں خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ اپنے اپنے دور کے سماجی مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے مذکورہ بالا تینوں شعرا نے ترقی پسند بیانیے کی روایت کو ایک نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ ذیل میں تنویر سپرا، اقبال ساجد اریوسف حسن کی شاعری کا ترقی پسند بیانیے کے تحت سماجی مسائل کے تناظر میں مطالعہ کرتے ہوئے تجزیہ و تقابل کیا جائے گا۔

## تنویر سپرا کی شاعری میں سماجی مسائل:

محمد حیات تنویر سپرا کی شاعری ترقی پسندی کا ایک تاثراتی تجزیہ ہے۔ تنویر سپرا کی شاعری سماجی مسائل کا بھرپور اظہار ہے۔ سپرا بنیادی طور پر خود ایک مزدور باپ کے بیٹے تھے اور بعد ازاں وہ خود بھی ساری زندگی ایک

مزدور کی حیثیت سے زندہ رہے۔ اس لیے انسانی زندگی کے وہ تمام ممکنہ مسائل جن کا سامنا ایک مزدور کو کرنا پڑتا ہے تنویر سپرا کا ان سے واسطہ پڑا ہے۔ اس لے سپرا کی شاعری میں بھی ان مسائل کا بے دھڑک اظہار ملتا ہے۔ تنویر سپرا کی شاعری عوامی اور سماجی مسائل کا لازوال امتزاج ہے۔ ان کی شاعری میں ان کا شخصی اور ذاتی تجزیہ کار فرما نظر آتا ہے۔ تنویر سپرا کی شاعری ایک مزدور کی شاعری ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں ایک مزدور کی سی گھن گرج، سماجی ناہمواری، سرمایہ داوری نظام کے بطن سے پھوٹنے والے مسائل اور جدید صنعتی و مشینی اعصاب شکن پیداواری نظام کے خلاف غم و غصہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ تنویر سپرا کی شاعری میں سماجی مسائل کا احاطہ مختلف زاویوں سے کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری کے سماجی تنوع کے حوالے سے یوسف حسن اپنے ایک مضمون میں یوں لکھتے ہیں:

> "اس کی شاعری میں جان دار موضوعاتی اور فنی تنوع ملتا ہے۔ اس کا موضوعاتی تنوع سماجی زندگی سے لے کر فطری انسانی رشتوں کے اظہار تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی فعال زندگی، حقیقی تجربات و مشاہدات سے ماخوذ ہونے کی بنا پر اس تنوع میں بھی حرکت و حرارت موجود ہے۔"(۳)

تنویر سپرا اپنی شاعری میں ایک مزدور کے احساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ سماجی ناہمواری کے اثرات سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس معاشی و سماجی تضاد کو ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے بھرپور آواز بخشتے ہیں اور ایک عام انسان، مزدور کو زندگی کے جن مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اس کو بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں بھوک، غربت، بے روزگاری، مہنگائی، ظلم، جبر، استحصال، افلاس و ننگ، ناانصافی، معاشی ناہمواری سے پیدا ہونے والا احساس محرومی، مشینی زندگی کے انسانی اعصاب پر اثرات، اوور ٹائم اور شفٹوں کے ذریعے استحصال زدہ مزدور، سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارنہ قدروں سے منہدم ہوتے انسانی و سماجی رشتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

انسانی معاشرے کو درپیش سب سے قدیم اور خوف ناک سماجی مسئلہ بھوک کا ہے۔ بھوک انسانی سماج میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسانی اخلاقیات اور سماج کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ سپرا کی شاعری میں بھوک پر شعر ملاحظہ ہو:

اب کھیت میں گندم کی جگہ بھوک اگے گی
اس دور کے انساں سے زمیں روٹھ گئی ہے(۴)

تنویر سپرا مساویانہ نظام سے اس بھوک کا خاتمہ چاہتے ہیں وہ محض الفاظ اور تقریروں کے سہارے زندگی بسر کرنے کے قائل نہیں ہیں۔

بے پر کی کوئی بات نہیں چاہیے مجھ کو
تقریر مساوات نہیں چاہیے مجھ کو
یہ لفظ ہیں، لفظوں سے کہیں بھوک مٹی ہے؟
منشور کی سوغات نہیں چاہیے مجھ کو
مخلص ہو تو تقسیم کرو زر کو ابھی سے
وعدوں کی سیہ رات نہیں چاہیے مجھ کو (۵)

قبضہ گیر طبقے کے سیاسی اعلانات اور الفاظ کے بجائے تنویر سپرا تقسیم زر یعنی دولت کی منصفانہ تقسیم کو ہی بھوک کے خاتمے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ خالی سیاسی الفاظ کی جگالی اور تقریروں کو وہ بے معنی قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھوک اور پیاس کے اثرات کو کچھ ایسے انداز میں ایک اور جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

آخر کب تک اپنے جی کو دوں تسکیں سرابوں سے
جان بلب ہوں میرے منہ میں امرت رس ٹپکاؤ بھی
بھوکے کو روٹی ملتی ہے جس کی مالا جپنے سے
یہ گر جھوٹ نہیں تو اس منتر کا پاٹھ کراؤ بھائی(۶)

مزدور طبقے کے لوگ ساری زندگی بھوک اور احتیاجات میں زندگی بسر کرنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں۔ اپنے ہی کسی مفلس بھوکے محتاج اور حاجت مند سے وہ ایک جگہ یوں مخاطب ہیں:

میرے گھر سے بھوک تیری آنکھ میں دو چند ہے
میں بھی ہوں محتاج لیکن تو بھی حاجت مند ہے(۷)

سرمایہ داری نظام مزدور طبقے کا استحصال کرتے ہوئے ان کی محنت سے پیدا شدہ دولت پر قابض ہو کر مزدوروں اور محنت کشوں پر مصنوعی بھوک مسلط کرتا ہے۔ تنویر سپرا کو اس بات کا گہرا شعور ہے۔ اس لیے وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

رکھتا ہے گرم جو ترے چولہے کو رات دن
دے ایندھن اس کو پیٹ کے تندور کے لیے(۸)

بھوک اور غربت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سپرا کے ہاں بھوک کا جو احساس شدت کے ساتھ ملتا ہے اس کی بنیادی وجہ غربت ہے۔ غربت ایک ایسا سماجی مسئلہ ہے جو دیگر سماجی و اخلاقی مسائل کی وجہ ہے۔ غربت اور بھوک کو تنویر سپرا کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

جن کے شکم میں صرف اجالے ہی پل سکیں
یا رب نئے بشر کو وہ مہتاب مائیں دے
جس جس کے پاس نہیں وہ عطا کر اسے
ملا کو روح کی مجھے تن کی غذائیں دے (۹)

غریب اور مزدور گھرانوں میں غربت کی ایک بنیادی وجہ گھر میں کسی ایک کفیل شخص کا ہونا بھی ہے۔ آمدنی اور اخراجات کا یہ توازن کبھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ تنویر سپرا کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کے مسائل کا بھی گہرا ادراک ملتا ہے۔ وہ خود ایک ایسے غریب گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں ان مسائل کی بہتات تھی۔ جہاں گھر میں والدین کے رخصت ہونے کے بعد غربت مستقل ڈیرے ڈال دیتی ہے:

میرے گھر سے جونہی بابا جان کا سایہ اٹھا
مفلسی کے دھوپ شعلے صحن میں بسنے لگے(۱۰)

ایسے گھروں میں باپ کی رخصتی احساس محرومی اور غربت کے سائے لاتی ہے۔ سپرا کے ہاں غربت کا یہ گہرا اور شدید احساس اس کی ذاتی زندگی سے عبارت ہے۔

مردوں کی طرح جس میں مرا باپ جیا ہے
وہ صورت حالات نہیں چاہیے مجھ کو(۱۱)

مگر اس تمام تر صورت حال کے باوجود تنویر سپرا بھوک اور غربت کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں مایوس نہیں ہے۔ اسے اس بات کا یقین ہے کہ غربت کی یہ گھٹا جو اس وقت ہمارے وطن کے اوپر چھائی ہوئی ہے وہ گھٹا چھٹ جائے گی اور فرسودہ نظام جس کی وجہ سے غربت اور بھوک پیدا ہو رہی ہے وہ عنقریب اپنا وجود کھو دے گا۔

اس لیے تنویر سپرا کی شاعری میں شدید غربت اور بھوک کے احساس کے باوجود ایک رجائیت ملتی ہے اور اس رجائیت کا اظہار ان کے ہاں یوں ملتا ہے۔

اس دیس سے غربت کی گھٹا چھٹ کے رہے گی
تقدیر کی فرسودہ کڑی کٹ کے رہے گی
مزدور کی محنت کا صلہ چھیننے والو
اب آپ کی ہر چیز یہاں بٹ کے رہے گی(۱۲)

ایک حقیقی ادیب اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ادب کے ذریعے اپنے سماج کی حالت زار اور مفلسی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ سپرا کی شاعری میں جابجا غربت اور مزدور لوگوں کی حالت زار اور مفلسی کا اظہار ملتا ہے۔ اس ننگ و افلاس کی وجہ سے مزدور اور غریب عوام کے چہرے پر زردی چھائی رہتی ہے۔

منصف کے ایک گھر کے سوا شہر عدل میں
ہر شخص کے مکاں کا چہرہ ملول تھا(۱۳)

چھت کی کڑیاں جانچ لے دیوار و در کر دیکھ لے
مجھ کو اپنانے سے پہلے میرے گھر کو دیکھ لے(۱۴)

تنویر سپرا زندگی کے ننگ کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

کیوں مقبروں پہ زر کی چڑھاتا ہے چادریں
دے زندگی کے ننگے بدن پر اچھاڑ تو(۱۵)

کہیں کہیں سپرا کو اس ننگ و افلاس کی وجہ سے بننے والے طبقے کے وجود پر غصہ بھی آتا ہے اور وہ اپنے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ان الفاظ کا سہارا لیتا ہے۔

بپھرے ہوئے ہجوم کو ان کی تلاش تھی
جن کے وجود باعث افلاس و ننگ تھے(۱۶)

اس غصے کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ سپرا کے خیال میں ان کے چہروں پر جو ننگ و افلاس رقم کی گئی ہے وہ اس نظام میں موجود چند لوگ نہیں جو اپنے جیسے انسانوں کو ننگ و افلاس کا شکار کر کے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ اس کو فطرت کی تقسیم ماننے سے انکار کرتے ہوئے انسان کی تقسیم قرار دیتے ہیں۔

انسان ہی انسان کو بناتا ہے گداگر
فطرت کی عنایات میں افلاس نہیں ہے

انسان گزیدہ ہوں مرے حق میں رہا کر
اس زہر کا تریاق ترے پاس نہیں ہے(۱۷)

سپرا کی شاعری میں ننگ و افلاس کا ذکر بار دگر ملتا ہے۔ وہ خود اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو ساری زندگی بنیادی زندگی کی ضروریات کے حصول میں گزار دیتا ہے۔ تنویر سپرا اس بات کی خواہش کرتا ہے کہ تمام انسانوں کو اس ننگ و افلاس سے چھٹکارا مل جائے:

عریاں بدن ہیں چادر شب کی پناہ میں
پہلے انہیں لباس دے پھر آفتاب دے(۱۸)

تنویر سپرا کی شاعری ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف بھرپور احتجاج ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں سرمایہ داری نظام کے استحصال کے خلاف غم و غصہ ملتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار وڈیرے جاگیر دار مزدوروں کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔ انہیں اپنی اس محنت کے استحصال کا شدید احساس ہے۔ جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

جتنا بڑھیا مال بناؤں لے جا زردار
اپنا سینہ گھٹیا سگریٹ سے پھونکوں دن رین
بَیر، وہسکی، بنگلہ کاریں سیٹھوں کی جاگیر
میری قسمت آہیں آنسو، نالے چیخیں بین
میں جاہل میں غیر مہذب میں کافر میں چور
میری قسمت کا پھل کھانے والے جنٹلمین(۱۹)

سپرا اس سماجی استحصال کی چیخ و پکار کو بطور آرٹسٹ سنتے ہیں اور اپنے اعصاب پر ان کے اثرات کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

یا بھر دو میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ
یا کہہ دو نحیفوں سے آہستہ کراہیں(۲۰)

وہ استحصال اور جبر کے اس موسم کو سرمایہ داری سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے خاتمے کی بھی خواہش کرتے ہیں۔

اب زرد رتیں ختم کرو زرد خداؤ
ہیں منتظر موسم گل سب کی نگاہیں(۲۱)

سپرا حصار جبر کے پھاٹک سلگ اٹھے
لگتا ہے کام کر گئیں گرمائشیں تیری(۲۲)

تنویر سپرا سماجی جبر و استحصال کے خلاف کہیں کہیں تو شدید غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ سرمایہ دار طبقے کی زندگی اور ایک مزدور کی زندگی میں جو تفاوت ہوتا ہے وہ شدید نوعیت کا بحران پیدا کر دیتا ہے۔ اس ظلم و جبر کے خلاف وہ اس طرح آواز بلند کرتے ہیں:

مل مالک کے کتے بھی چربیلے ہیں
لیکن مزدوروں کے چہرے پیلے ہیں
کل بھی میرے آگے ظلم کے پربت تھے
آج بھی میری راہ میں جبر کے ٹیلے ہیں(۲۳)

مزدوروں اور محنت کشوں کی نمائندگی کرتے ہوئے سپرا تاریخ کے اوراق میں رئیسوں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے استحصال کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

مجھ پہ ہر آن رئیسوں کا غضب ٹوٹا ہے
مجھ کو ہر دور میں لوٹا ہے خداوندوں نے
میرا ہر عہد میں آجر نے لہو چوسا ہے
مجھ پہ ڈھائے ہیں ستم بن کے خدا بندوں نے(۲۴)

سپرا کے شعروں میں انصاف کے دہرے میعاروں اور ناانصافی کے خلاف بھی رد عمل ملتا ہے:

میں نے زنجیر کھینچی تھی در انصاف کی
میری ہی مشکیں محافظ عدل کسنے لگے(۲۵)

میں درانصاف پر بم کی طرح پھٹ جاؤں گا
گر وکیلوں نے خموشی کی مجھے تاکید کی(۲۶)

سپرا کی شاعری میں ایک اہم سماجی مسئلے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ احساس محرومی غریب طبقے کی زندگی کا لازمی حصہ ہوتی ہے جہاں کبھی غریب آدمی زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہو کر تو کبھی ناقدری اور سماجی رویوں کے ہاتھوں احساس محرومی کے شدید احساس سے دوچار ہوتا ہے۔

سپرا جو روشنی مری تقدیر میں نہیں
اس روشنی کی مانگ، میں سیندور کیوں بھر دی(۲۷)

کس طرح تنویر سپرا دور ہوئی دوریاں
میں اندھیرا جھونپڑے کا وہ محل کا نور تھا(۲۸)

محروم ہونے کا احساس ان کی تلخ زندگی کے تجربات کا نچوڑ بھی ہے جہاں ایک زندہ اور جیتا جاگتا انسان اس احساس محرومی سے نکلنا چاہتا ہے جو کہ فطری طور پر اس کا مقدر نہیں ہے۔

مُردوں کی طرح جس میں مرا باپ جیا ہے
وہ صورت حالات نہیں چاہیے مجھ کو(۲۹)

اسی احساس محرومی کو جو نسل در نسل غریب مفلس عوام کا مقدر ہوتی ہے وہ بہت کرب کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں:

میں اپنے بچپنے میں چھو نہ پایا جن کھلونوں کو
انہی کے واسطے اب میرا بیٹا بھی مچلتا ہے(۳۰)

احساس محرومی کا یہ کرب بعض اوقات جان لیوا حد تک بڑھ جاتا ہے۔ جب ایک باپ اپنے بیٹے کو اس کا پسندیدہ کھلونا تک نہ دلا پائے اور اس کی معصوم ضد پر اس کو ڈانٹنا پڑ جائے۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا سماجی مسئلہ ہے جو احساس محرومی کی صورت عبارت ہے۔

بیٹے کو سزا دے کے عجب حال ہوا ہے
دل پہروں مرا کرب کے دوزخ میں جلا ہے(۳۱)

تنویر سپرا کی شاعری میں اس کے علاوہ دیگر سماجی مسائل پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ مہنگائی ایک اہم سماجی مسئلہ ہے۔ اشیائے خوردونوش اور دیگر ضرورت کی چیزوں کے مہنگے ہونے کی وجہ ایک عام انسان کی زندگی شدید متاثر ہوتی ہے۔ سپرا کی شاعری میں مہنگائی کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

اس بار گرانی کے ہوئے اتنے دھماکے
ہر شخص کی تنویر کمر ٹوٹ رہی ہے(۳۲)

رتبہ بڑھا تو ساتھ ہی رسوائی بڑھ گئی
تنخواہ کے حساب سے مہنگائی بڑھ گئی(۳۳)

مہنگائی جدید زمانے کی معیشت کا ایک اہم سماجی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کی وجہ سے تمام غریب لوگوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

گاہک سے تو کلو میں چکاتا ہے قیمتیں
پر مال تولتا ہے ابھی تک وہ سیر میں(۳۴)

تنویر سپرا کی شاعری نئے دور کے ایک اہم سماجی مسئلے کی طرف نشان دہی کرتی ہے۔ یہ نئے عہد میں مشینی زندگی کی انسانی اعصاب کو شل کرتی ہوئی یلغار اور مشینی زندگی سے پیدا ہونے والے مسائل کا احاطہ کرتی ہوئی شاعری ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام میں ایک مزدور اپنی انفرادیت کو ختم کر کے اس مشینی زندگی کے تسلط اور جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ سید سبط حسن اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "سرمایہ داری نظام میں مشینوں کی کارکردگی اور پیداواریت کو بڑھانے کی ان تھک کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے نئی نئی خودکار مشینیں اور جدید آلات ایجاد کیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محنت کار کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ خود بھی مشین کا ایک پرزہ بن جاتا ہے۔"(۳۵)

اس اعصاب شکن مشینی تسلط کو تنویر سپرا اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

اب تک مرے اعصاب پہ محنت ہے مسلط
اب تک مرے کانوں میں مشینوں کی صدا ہے(۳۶)

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے(۳۷)

آہستہ آہستہ یہ مشینیں اعصاب کو شل کر دیتی ہیں اور ایک مزدور اور محنت کش کی آواز اور محنت ان مشینوں کے نیچے آکر دب جاتی ہے۔ تنویر سپرا اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

تنویر اب تو حلق سے بھونپو کا کام لے
بہرے ہوئے ہیں کان مشینوں کے شور سے(۳۸)

مگر ان بوموں اور مشینوں کے چلانے کے باوجود سپرا کے اندر کا آرٹسٹ زندہ رہتا ہے اور وہ اپنی جمالیاتی تسکین کے لیے اس خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

شب کی دہشت اور بڑھی ہے بوموں کے چلانے سے
صبح کے خوش الحان پرندو فجر کے نغمے گاؤ بھی(۳۹)

مشینوں کی اس یلغار سے انسانی اعصاب پہ جو اثرات پڑتے ہیں وہ جھنجلاہٹ اور نفسیاتی دباؤ کا سبب بنتے ہیں اور یوں وہ ان آوازوں کے شور سے بھاگنا چاہتا ہے۔

سوتا ہوں اب تو انگلیاں کانوں میں ٹھونس کر
بوموں کی اتنی قوت گویائی بڑھ گئی(۴۰)

مشینی زندگی کا اتنا گہرا مطالعہ اور ان کے اثرات کا تجزیہ و اظہار دراصل سپرا کی زندگی کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہے۔ اس تجربے اور مشاہدے سے تقریباً ہر مزدور اپنی زندگی سے گزرتا ہے۔ تنویر سپرا خود ایک مزدور تھے انھوں نے اس نظام سرمایہ داریت میں مزدوروں کی زندگی کے ان تمام مسائل کا سامنا کیا جو ہمارے سماج میں موجود ہیں۔ نیو لبرل اکانومی میں سرمایہ دار مزدوروں کو شفٹوں اور اوور ٹائم میں بھی کام کرنے پر مجبور کرتا ہے اور مزدور بھی اپنی مجبوریوں اور ضروریات زندگی کے حصول کے لیے اس چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ ایک سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ دولت کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک گر جاتا ہے۔ کارل مارکس اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

"محنت کی سماجی پیداواریت میں اضافے کے تمام طریقے محنت کاروں کے صرف پر اختیار کیے جاتے ہیں۔ پیداوار بڑھانے کے تمام ذریعے پیدا کرنے والوں پر غلبہ پانے اور ان کا استحصال کرنے کے ذریعوں میں بدل جاتے ہیں۔ یہ ذریعے محنت کار کی

شخصیت کو مسخ کر کے اس کو لا انسان بنا دیتے ہیں اور کام کی دلکشی کو ختم کر کے کام کو
قابل نفرت بیگار میں تبدیل کر دیتے ہیں۔"(۴۱)

سپرا کی شاعری میں سرمایہ داروں اور سیٹھوں کی اس ہوس کو "اوور ٹائم" اور "شفٹ" کی اصطلاحوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ جس میں آج کے جدید مزدور سرمایہ داروں کی تجوریوں کو اپنے احساسات کو کچل کر کے بھرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اوور ٹائم کر کے میں نے سیٹھ کی جھولی کو بھر دی
پر بچوں کی فرمائش کو آئندہ پر ٹالا ہے(۴۲)

رات کی شفٹ چلا کر مجھ کو خوابوں سے محروم کیا
میرے آجر نے میری فطرت پر ڈاکہ ڈالا ہے(۴۳)

سپرا کو اس بات کی مکمل آگہی ہے کہ مل مالک اس کی محنت کا استحصال کر رہا ہے۔ وہ اپنی محنت سے کسی بھی طور پر بیگانہ نظر نہیں آتا۔

آج بھی سپرا اس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے
میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں(۴۴)

سپرا کی شاعری میں اس کے علاوہ دیگر سماجی مسائل کا بھی ذکر ملتا ہے، جہالت، بیماری، چاپلوسی منافقت، ذات پات کی تقسیم، مذہبی منافرت، خود غرضی، ماحولیاتی تبدیلیوں، شہری زندگی کے مسائل سپرا کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ جہالت پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جہالت پر نقاب علم و حکمت ڈالنے والو
تمہاری اصل پوشیدہ نہیں اہل بصارت سے(۴۵)

بیماری کے حوالے سے شعر ملاحظہ ہو:

تنویر اپنے پھیپھڑوں کے ایکسرے دے
خطرے کی گھنٹیاں کہیں مسلسل حرارتیں(۴۶)

ماحولیاتی اثرات کے حوالے سے ان مندرجہ ذیل دو اشعار ملاحظہ کریں۔

ہر رکتی ہوئی سانس کو سگریٹ کا دھواں ہے
اس عہد کے انسان کو ہوا راس نہیں ہے(۴۷)

شہری زندگی نے مسائل کو یوں بیان کیا ہے:

دیہات کے وجود کو قصبہ نگل گیا
قصبے کا جسم شہر کی بنیاد کھا گئی(۴۸)

آج مجھے شہروں کے شور شرابے نے ہلکان کیا
کل میں سناٹوں سے گھبرا کر بھاگا تھا گاؤں سے(۴۹)

ذات پات کی تقسیم، تفرقہ بازی اور مذہبی تقسیم کی وجہ سے کسی بھی معاشرے میں توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے اور جلد یا بدیر وہ معاشرہ اس تقسیم کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔ تنویر سپرا اپنی شاعری میں اس ذات پات کی نفی کرتے ہیں۔ اور تفرقے بازی اور مذہبی منافرت کی بھی سختی سے مذمت کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے منشور میں میں بھی اس بات کا اعادہ موجود تھا کہ ایک حقیقی ادیب اپنے سماج میں اس قسم کی تقسیم کی سختی سے مذمت کرے گا۔ ابتدائی اعلانات میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ ترقی پسند ادیب ہر قسم کے رجعت پسند خیالات کی روک تھام کرے گا۔

> "ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انبار سعید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جاسکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔"(۵۰)

تنویر سپرا کی شاعری ترقی پسند تحریک کے اس اعلان نامے کا جدید اظہار ہے جو کہ ایک طویل وقت طے کرنے کے بعد بھی قابل عمل ہے وہ اپنی شاعری میں ذات پات کی تھی اس انداز میں کرتے ہیں۔

پھوٹے گا اب کبھی نہ یہاں چھوت چھات کا درخت
سختی سے روک دی گئیں افزائشیں تری(۵۱)

اور کہیں وہ روشن دماغ لوگوں کو فرقوں میں تقسیم دیکھ کر یوں طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

شیشے دلوں کے گرد کے تعصب سے اٹ گئے
روشن دماغ لوگ بھی فرقوں میں بٹ گئے(۵۲)

تنویر سپرا کی شاعری میں متذکرہ بالا سماجی مسائل براہ راست سرمایہ داری، جاگیر داری نظام سے ملتے ہیں۔ جس نظام کی وجہ سے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی ہے اور جاگیر دار اور سرمایہ دار محنت کش طبقے کی دولت پر ناجائز قبضہ کر کے ان کے لیے سماجی مسائل کے انبار لگا دیتے ہیں۔ سپرا کی شاعری میں سماجی مسائل کی وجہ یہی نظام سرمایہ داریت ہے۔ جس کا اظہار وہ بھرپور انداز میں اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔

جتنا بڑھایا مال بناؤں لے جائے زردار
اپنا سینہ گھٹیا سگریٹ سے پھونکوں دن رین(۵۳)

میں جاہل میں غیر مہذب میں کافر میں چور
میری محنت کا پھل کھانے والے جنٹلمین(۵۴)

تنویر سپرا اپنی شاعری میں سرمایہ داری نظام کے بہیمانہ استحصال کو آشکارہ کرتا ہے۔ جہاں غریب زندگی بنیادی ضروریات کے لیے ترس رہا ہوتا ہے تو وہاں ان امرا اور رئیسوں کی زندگی کی عیاشیاں کچھ یوں ہوتی ہیں۔

مل ملک کے کتے بھی چربیلے ہیں
لیکن مزدوروں کے چہرے پیلے ہیں(۵۵)

سرمایہ داری نظام کی ہوس کو وہ یوں نشانہ طنز بناتا ہے جب سرمایہ دار اشیائے پید اور انسانی ضروریات کے بجائے خالصتاً منافعے کی غرض سے کرتا ہے۔

گر فیض کی طلب ہے تو بندوق کی جگہ
بیساکھیاں بنا کسی مزدور کے لیے(۵۶)

نظام زر کے کھوکھلے پن کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

لوگ اپنی دھاندلی کی سزا دوسروں کو دیں
سپرا نظام زر میں یہ رسم قدیم ہے(۵۷)

تنویر سپرا کی شاعری میں آج کے دور جدید میں پیش آنے والے تمام مسائل احاطہ بخوبی ملتا ہے۔ بھوک، غربت، استحصال، جبر، ننگ، افلاس، بیماری، مہنگائی سمیت نیو لبرل معیشت کے بطن سے پیدا ہوتے ہوئے مسائل، مشینی اور شہری زندگی کے مسائل سمیت تقریباً ہر سماجی مسئلے پر سپرا کی شاعری میں اظہار ملتا ہے۔ سپرا کی شاعری ایک حقیقی ترقی پسند شاعر کی شاعری ہے۔ جو اپنے سماج میں موجود مسائل سے قطع نظر، نظریں چرانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ہر انسانی مسئلے کو انتہائی توانا آواز کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

اقبال ساجد کی شاعری میں سماجی مسائل:

ترقی پسند تحریک کے بحرانی دور کے بعد تحریک اگرچہ ظاہری طور پر ختم ہوئی تھی مگر اس کے باوجود اس کے اثرات نے آنے والے دور کے تقریباً سب شعرا کو متاثر کیا۔ یہی وجہ تھی اب کسی شاعر کے لیے اپنے سماج سے کٹ کر محض داخلی وارادات کی بنیاد پر شعر کہنا شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر مشکل تھا۔ اس لیے پاکستان میں ہر شاعر کی شاعری میں ترقی پسند عناصر تقریباً مل ہی جاتے ہیں۔ اقبال ساجد ترقی پسند شاعری کا جدید اور تازہ اظہار ہیں۔ ان کی شاعری اپنی سماجی بیانیے اور مسائل کے اظہار کا تاثراتی تجربہ ہے۔ تنویر سپرا کی طرح اقبال ساجد کی ذاتی زندگی بھی انہی مسائل سے عبارت ہے جن میں ایک غریب اور عام انسان ساری زندگی پستا ہے۔ بھوک اور غربت میں پستی ہوئی عوام کے دکھوں کا اظہار ہو یا ننگ و افلاس، مہنگائی، جبر استحصال کے دکھ ہوں۔ اقبال ساجد نے اپنی شاعری میں بہت بہترین انداز میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ احساس محرومی اور غربت کی وجہ سے سماجی رشتوں کے انہدام کو بھی اقبال ساجد نے شعر کی زبان میں بیان کیا ہے۔ اقبال ساجد نے اپنی شاعری کے ذریعے ہمارے سماج کے ان مسائل کو بھی قلم زد کیا ہے جو ہمارے معاشرے کی مجموعی اخلاقیات کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے سماجی گھٹن، منافقت، بے حسی، خود غرضی، لالچ، رشتوں کی بیگانگی، جہالت جیسے مسائل کو اپنی شاعری کے موضوعات میں استعمال کیا ہے۔

اقبال ساجد کی زندگی ان محرومیوں اور مسائل کا نوحہ تھا جو ان کی شاعری میں ظاہر ہوتی ہیں۔ غربت، بے روزگاری، ایک انسان کو بعض اوقات ناپسندیدہ عمل کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ انسانی اخلاقیات کی تباہی کا بھی سبب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال ساجد کی زندگی بھی انہی تضادات کا مجموعہ تھی۔ جواز جعفری کے بقول:

"اقبال ساجد ایک عجیب و غریب انسان تھا۔ اس کی زندگی محرومیوں اور تضادات کا مجموعہ تھی۔ مثال کے طور پر اس کی ذات میں پائے جانے والے اس تضاد پر لوگ سخت حیران ہیں کہ اتنا اچھا انسان اتنا برا انسان کیوں تھا؟ اس قسم کے سوالات کا جواب دینے کے لیے ہمیں اس کے ارد گرد کے ماحول اور اس کی ذات کا سماجی اخلاقی اور نفسیاتی مطالعہ کرنا ہو گا۔ کیوں کہ کسی بھی فن کار کے فن کو اس کے مخصوص سماجی ماحول میں رکھ کر بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ ساجد کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک نارض خو انسان اور فن کار تھا۔ یہ ناراض خوئی بیک وقت سسٹم، اپنی برادری کے تخلیق کاروں اور خود اپنی ذات کے ساتھ بھی تھی۔"(۵۸)

اس نفسیاتی تجزیے سے معلوم پڑتا ہے کہ اقبال ساجد کی شاعری میں ناراضی اور سماجی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے دراصل وہ ان کی نجی زندگی کے تجربات ہیں۔ اس لیے اقبال ساجد کے ہاں بھوک، غربت، استحصال، سماجی منافقت، مہنگائی، ننگ و افلاس، احساس ذات کی بیگانگی، ناقدری کا گہرا احساس پوشیدہ ہے۔ اس لیے اقبال ساجد کے ہاں ہمیں جب بھوک اور غربت کا احساس گہرا ہوتا ہوا نظر آتا ہے تو فوراً قاری کا خیال اسی سماجی مسئلے کو بھانپ لیتا ہے جس کی وجہ سے ایک شاعر اس دکھ اور کرب کو بیان کر رہا ہوتا ہے۔ ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال ساجد اسی بھوک اور غربت پر سوال اٹھاتے ہیں۔

غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا
چپ چاپ گھر کے صحن میں فاقے بچھا دیے
روزی رساں سے ہم نے گلہ کچھ نہیں کیا(۵۹)

بھوک کی اس آگ کا گلہ تو وہ بظاہر خدا سے کرتے نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں اقبال ساجد یہ سوال اس غیر فطری نظام پر اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے شعروں میں بھوک ایک اہم سماجی مسئلہ کے طور پر نظر آتی ہے۔

تم نے سونے کی ڈلی کیا مجھ کو لا کر دی؟
میں نے بچوں کو اگر بھوک کما کر دی(۶۰)

میں بھوک لکھ رہا ہوں تم عشق لکھ رہے ہو
وہ قحط ہے کھاتی مائیں ہیں اپنے جائے(۶۱)

اقبال ساجد کے ہاں بھوک کے مضمون کی بہتات نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ہمارے نظام میں ایک طرف لاکھوں لوگ بھوک کا شکار نظر آتے ہیں تو دوسری طرف چند لوگ زندگی کے ہر سامان سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نظر آرہے ہوتے ہیں۔ اس لیے اقبال ساجد کے ہاں بھی بھوک ایک اہم سماجی مسئلے کے طور پر نظر آتی ہے۔

میں بھوک پہنوں، میں بھوک اوڑھوں میں بھوک دیکھوں میں پیاس لکھوں
برہنہ جسموں کے واسطے میں خیال کاتوں، پیاس لکھوں (۶۲)

بھوک انسان کو وحشی بنا دیتی ہے۔ وہ تمام تر اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر صرف اپنی بھوک مٹانے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس لیے تمام سماجی مسائل میں خوف ناک ترین سماجی مسئلہ بھوک کا ہے جس کی وجہ سے ایک انسان جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایک انسان اس بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمام تر اخلاقیات کو ترک کر دیتا ہے۔ سبط حسن کے بقول:

"موجودہ معاشرے کی اساس باہمی تعاون کے بجائے مقابلے اور منافقت پر ہے۔ چنانچہ ہر طبقے اور ہر پیشے کا انسان مقابلے کے مرض میں مبتلا ہے اور دوسرے شخص کو ایسا حریف خیال کرتا ہے۔ ہماری ذہنی حالت اس بھوکے کی سی ہے جس کو کئی دن بعد روٹی ملے تو ہر راہ چلتے سے ڈرے کہ وہ میری روٹی چھین لے گا۔ زندگی کا واحد مقصد روزی، روزگار حاصل کرنا رہ گیا ہے۔"(۶۳)

اس لیے ایک انسان کو جب کھانے جیسی بنیادی ضرورت زندگی سے محروم کر دیا جاتا ہے تو وہ اس ضرورت کو پوری کرنے کے لیے بھیک مانگنے یا چوری کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

چھینا جھپٹی کی مزاروں پر تبرک کے لیے
بھوک جب حد سے بڑھی خیرات کا کھانا پڑا
کیا کروں مجبور تھا، حق چھیننے کے واسطے
غیر اخلاقی رویے کو بھی اپنانا پڑا(۶۴)

ہر پیٹ میں اک بھوک کی سنگین لگی
پھر فاقہ زدہ شہر میں خنجر نکلے(٦٥)

اقبال ساجد کے ہاں غربت اور بھوک کو سماجی المیے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ سماجی المیہ دراصل ان کے ذاتی تجربے کی بنیاد سے پھوٹ کر شعری زبان اختیار کرتا ہے۔

غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا
غربت کی تیز آنچ پہ اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا (٦٦)

اس غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انسان کو بعض اوقات ناپسندیدہ عمل بھی کرنے پڑتے ہیں۔ غربت انسان کو اس حد تک مجبور کر دیتی ہے کہ انسان اپنے جسم کے ساتھ ساتھ خودداری کا بھی سودا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اقبال ساجد اس غربت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا
چلتے پھرتے تھیٹروں میں ایک جوکر کی طرح
ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا
اپنی غزلوں کے تراشے جسم پر چپکا لیے
مشتہر خود کو سر بازار بھی کرنا پڑا(٦٧)

بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے ایک غریب اور عام انسان کو بعض اوقات اپنی زندگی، گھر ہر چیز کو رہن رکھنا پڑتا ہے۔ اس صورت حال کو اقبال ساجد یوں بیان کرتے ہیں۔

مکان گروی، درودیوار گروی
ہماری خواہشیں، میعار گروی
ہمارے سر رکھے ہیں رہن اس نے
ہمارے نام کی دستار گروی(٦٨)

اس غربت اور تنگ دستی کے اثرات انسانی رشتوں پر بھی پڑتے ہیں جہاں لوگ تعلق بھی پیسے اور دولت کی بنیاد پر قائم کرتے ہیں۔ غربت کی وجہ سے رشتے اور تعلق داری تک ختم ہو جاتی ہے۔

مجھ سے غربت مول لے کر، کون گھر لے جائے گا؟
تم مجھے رسوا سرِ بازار زر کرتے ہو کیوں(۶۹)

اس غربت کا احساس بعض جگہ پر اقبال ساجد کے ہاں شدت اختیار کر جاتا ہے۔ غربت انسانی رشتوں کو کس طرح متاثر کرتی ہے۔ اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہائے رے حالات اک مہمان لوٹانا پڑا
میں نہیں گھر میں یہ بچے سے کہلوانا پڑا

میں نے اپنی بے بسی پر خود لگائے قہقہے
آنسوؤں کی بارشوں میں جسم جھلسانا پڑا (۷۰)

غربت اور حالات کے جبر انسان کو اس حد تک مجبور کر دیتے ہیں وہ بعض ایسے کام کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں جو عام حالات میں انسان کبھی کرنا پسند نہ کرے۔

جانور کی کھال پہنی اور چلا پنجوں کے بل
بن گیا بہروپیا، بازار میں آنا پڑا
دوسرں کے جرم اپنے نام پر لکھوا لیے
دوستو! روٹی کی خاطر جیل بھی جانا پڑا(۷۱)

اس غربت تنگ و افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ ناپسندیدہ عمل کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ اقبال ساجد نے اپنی شاعری میں غریب اور مجبور عوام کے ان عوامی مسائل کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے اور سماجی حقیقت کو بہت جاندار انداز میں مکمل حقیقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بھوک اور غربت انسان کو سوال بلند کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس صورت حال کو وہ کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا(۷۲)

خوف دل میں ترے در کے گدانے رکھا
دن کو کشکول بھرا، شب کو سرہانے رکھا(۷۳)

غربت اور افلاس خدشات کے در وا کر دیتی ہیں اور انسان پر زندگی کو تنگ کر دیتی ہیں۔

بس ایک سوچ ہے جس سے میں روز ڈرتا ہوں
یہ زندگی کہیں تم پر نہ تنگ ہو جائے(۷۴)

یہ ننگ و افلاس انسانی چہروں پر بھی عیاں ہوتے ہیں اور انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ اقبال ساجد اس کو یوں بیان کرتے ہیں۔

باہر سے دیکھیے تو بدن ہیں ہرے بھرے
لیکن لہو کا کال ہے اندر پڑا ہوا(۷۵)

مفلسی انسان کو زندگی کے ہر برے دن سے روشناس کراتی ہے۔ انسان کو بے گھری کے دکھ اور زندگی کے تلخ حقائق کا جب سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اپنی آخری متاع یعنی زندگی کو بھی کسی بھی قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اقبال ساجد اپنے ایک شعر میں اس ننگ و افلاس کے دکھ کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

مشکل سے ہو رہا ہے ساجد مرا گزارا
کوئی کرائے پر میری زندگی چڑھائے (۷۶)

اور ایک جگہ اس دکھ کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ جب انہیں ایک عام انسان کی زندگی کے کرب کو جینا پڑتا ہے۔

چھینا جھپٹی کی مزاروں پر تبرک کے لیے
بھوک جب حد سے بڑھی، خیرات کا کھانا پڑا(۷۷)

مہنگائی کے موضوع پر بھی اقبال ساجد کے ہاں شعر ملتے ہیں۔ مہنگائی کے اثرات کی وجہ سے عام اور غریب لوگوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اس کو اپنے شعروں میں یوں بیان کرتے ہیں۔

در و دیوار کی بنیاد کس بنیاد پر رکھوں
کبھی اینٹیں، کبھی مہنگے یہاں شہتیر بنتے ہیں(۷۸)

انسان کی قیمت تو کوئی خاص نہیں ہے
مٹی کا یہاں بھاؤ ہے سونے کے برابر(۷۹)

مہنگائی کے جن کے ہاتھوں کیا شہر اور کیا گاؤں تقریباً سارے شہر اور علاقے کے ستائے ہوئے ہیں وہ گرانی کی اس صورت حال کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔

گاؤں کے کچے گھر کی قیمتیں بڑھنے لگیں
شہر سے نقل مکانی اہل زر کرنے لگے(۸۰)

اقبال ساجد کی بیشتر زندگی محرومیوں، ناکامیوں دکھوں اور بیماریوں کا نوحہ ہے۔ اپنی ذات کی محرومیوں، ناکامیوں اور معاشرے کی طرف سے نفرت کے اظہار سے ان کا احساس محرومی اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ احساس محرومی ایک اہم سماجی مسئلہ ہے۔ اس سماجی مسئلے کے شکار لوگ ساری زندگی اپنی ذات کے دکھ اور زندگی کی تلخیوں کا شکار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال ساجد کی شاعری میں محرومی کے احساس کا یہ رنگ بہت گہرا ہے۔ ان کی احساس محرومی سے بعض دفعہ احساس تنہائی جنم لیتا ہے۔

ایسے گھر میں رہ رہا ہوں، دیکھ لے بے شک کوئی
جس کے دروازے کی قسمت میں نہیں دستک کوئی(۸۱)

وہ بھرے ہوئے بازاروں سے اشیا اور ضروریات زندگی کے بجائے صرف محرومی کا احساس لے کر آتے ہیں۔ یہ بھرے ہوئے بازار ان کو خود پر طنز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کو لگتا ہے کہ جیسے وہ ان سے مخاطب ہیں کہ تم ایک غریب اور محروم انسان ہو تمہارا انتخاب خوشیاں نہیں ہو سکتی۔ تمہارے حصے میں صرف غم آسکتے ہیں۔

اک طرف خوشیاں پڑیں تھیں اک طرف رکھے تھے کرب
کھل کے یہ منظر دکھائے شہر کے بازار نے(۸۲)

محرومی کا یہ احساس وقت اسی وقت اور بھی گہرا ہو جاتا ہے جب شہر بھر کے جاننے والے مفلسی اور غربت کے سبب آنکھیں چرا سکتے ہیں۔

کوئی دروازہ نہ کھولے گا صدائے درد پر
بستیوں میں شوروغل شام و سحر کرتے ہو کیوں

مجھ سے غربت مول لے کر، کون گھر لے جائے گا
تم مجھے رسوا سربازار کرتے ہو کیوں؟(۸۳)

کہیں کہیں فطرت ان کی اس محرومیوں پر ان کی دلجوئی کرتی دکھائی دیتی ہے۔

کل رات میرے ساتھ ستارے بھی رو پڑے
دیکھی گئی نہ ان سے تباہی امید کی (۸۴)

اقبال ساجد اپنی اس محرومی پر قدرت سے شکوہ کناں بھی دکھائی دیتے ہیں اور وہ قدرت سے مخاطب ہو کر یوں شکوہ کرتے ہیں۔

قدرت نے روشنی کا سہارا نہیں دیا
قسمت تو بخش دی ہے ستارا نہیں دیا(۸۵)

زندگیوں کی تلخیوں اور محرومیوں کا گلہ دراصل ان کے احساس محرومی کا اظہار ہی ہے۔ وہ بعض دفعہ زندگی سے خاصے دکھی اور ناراض دکھائی دیتے ہیں۔

زندگی بھیک کی صورت میں ملی ہے سب کو
پا کے اترائے نہ پوشاک پرانی کوئی(۸۶)

زندگی کے کرب کا اظہار ملاحظہ کیجیے:

دکھوں کے باغ میں ہر وقت شاخ زخم پھلتی ہے
ازل سے یہ شجر کرب ثمر میں رہتے ہیں(۸۷)

اقبال ساجد زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کو بعض جگہوں پر بالکل سادہ انداز میں قبول کر کے ان کو زندگی کا ہم سفر تسلیم کرتے ہیں۔

اے شب مفلسی کچھ سب کو بتا، مجھ سے ناراض ہو کر گئی تھی کہاں
کس کے آنگن میں تو نے اتاری تھکن، کس کے غربت کدے میں بسیرا کیا(۸۸)

اقبال ساجد زندگی کی محرومیوں کو شعری زبان عطا کر کے ایک نئی جدت سے پیش کرتے ہیں۔ غربت کے پسے ہوئے لوگ کسی بھی چیز کو خواہش کرتے ہیں تو وہ ان کے لیے وبال بن جاتی ہے۔ زندگی تو پہلے ہی تنگ ہوتی ہے مقدر اور قسمت کا بھی کال پڑا ہوتا ہے۔

میں نے جب بچپن کو لوٹا یا سہارے چھن گئے
کھیلنا چاہا تو ہاتھوں سے غبارے چھن گئے(۸۹)

میں کوئی یوسف نہیں جو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں
آپ ہی صحرا خریدا اس نے گلشن بیچ کر(۹۰)

اقبال ساجد کی شاعری میں جتنے بھی زندگی کے رنگ، دکھ، محرومیاں اور تلخیاں ہیں ان کا براہ راست تعلق ان کی ذاتی زندگی سے بھی ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ان تلخ نوائیوں میں گزرا ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری ان کی زندگی کی ان تلخیوں اور محرومیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آخری عمر میں مایوسیوں، محرومیوں اور بیماریوں نے اس کے نحیف جسم میں پنجے گاڑ لیے تھے اور وہ کچھوے کی طرح اپنی ذات میں سمٹنے لگا تھا۔ وہ شاعر جو کبھی سسٹم سے الجھتا تھا۔ اب خارجی قوتوں سے برسرِ پیکار ہونے کے بجائے اپنی ذات کے اندر پناہ ڈھونڈنے لگا۔"(۹۱)

ان سماجی مسائل کے علاوہ اقبال ساجد کی شاعری میں مارکیٹ کی دسترس جو انسانی زندگی کو شدید متاثر کرتی ہے کے حوالے سے بھی شعر ملتے ہیں۔ وہ بازار کی اصطلاح استعمال کر کے جدید مشینی زندگی کے اثرات اور نیولبرل اکانومی سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھی ادراک رکھتے ہیں اور شاعری میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

جیب میں کچھ بھی نہیں تھا پھر پگھلتی کس طرح
سرد مہری مجھ سے برتی گئی گرمی بازار میں(۹۲)

جدید صنعتی معیشت کے پھیلاؤ میں کارپوریٹ کلچر کی یلغار میں انسان کا شرف اور عزت اس کے انسان ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک مالدار خریدار ہونے کی وجہ سے ہے۔ اقبال ساجد مارکیٹ کی اس کمانڈ کو انسانیت کے خلاف توہین گردانتے ہیں اور اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اک طرف خوشیاں پڑیں تھیں اک طرف رکھے تھے کرب
کھل کے یہ منظر دکھائے شہر کے بازار نے(۹۳)

کارپوریٹ کلچر کے استحصال کو وہ ایک جگہ پر یوں آشکار کرتے ہیں۔

سینکڑوں قیمتی پرچوں میں چھپا میرا کلام
ہوئی پے منٹ تو اک آدھ رسالے سے ہوئی(۹۴)

مشینی دور میں انسان کے احساسات بھی مشین کے ساتھ شامل ہو کر مشین بن جاتے ہیں۔ انسان کے اندر سے جمالیاتی حس ختم ہوتی جاتی ہے۔ وہ روبوٹک زندگی میں مشین کا ہی ایک کل پرزہ بن جاتا ہے۔

مشینی دور میں کیا قصہ لب و رخسار
حکایت شب و زلفِ دراز کچھ بھی نہیں(۹۵)

بازار یعنی مارکیٹ میں محنت کے استحصال کو وہ بہت زبردست انداز میں بیان کرتے ہیں۔

لٹ گئے بازار میں میرے بھی سب پتھر کے چاند
اس کے ہاتھوں سے بھی مٹی کے ستارے چھن
گئے(۹۶)

اقبال ساجد کی شاعری میں جو اہم دیگر مسائل کا تذکرہ ہے ان میں منافقت، ریاکاری، تعصب، سماجی گھٹن، تنگ دستی، بے حسی، قدامت پرستی شامل ہیں۔ سماجی گھٹن کو کسی بھی معاشرے کی فضا کو حبس زدہ کر دیتی ہے۔ انسانی ذہن اس آلائش میں پرورش نہیں پا سکتا۔

سب کے سینوں میں ہے پھیلا ہوا سانسوں کا حبس
کوئی شہر ایسا نہیں جس کی فضا بوجھل نہ ہو(۹۷)

سماجی منافقت اور دہرے چہرے والے لوگوں کو یوں طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

لوگ اکثر اپنے چہروں پر چڑھا لیتے ہیں خول
تو جسے سونا سمجھتا ہے کہیں پیتل نہ ہو(۹۸)

اسی طرح اپنے ایک شعر میں انسانوں کی مردہ ضمیری اور بے حسی کو وہ شدید طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں:

بس رہا ہوں آج اس ماحول میں ساجد جہاں
لوگ باراتوں میں جاتے ہیں جنازے چھوڑ کر (۹۹)

سماجی جبر و استحصال کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ اقبال ساجد معاشرے میں پائے جانے والے جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ سماجی جبر طاقت کے عدم توازن سے پیدا ہوتا ہے۔ اقبال ساجد ظلم کے خلاف صرف آواز ہی نہیں بلند کرتے بلکہ وہ ظلم اور جبر کے خلاف شدید رد عمل دیتے ہوئے ظلم سہتے اور چپ کو ایک سماجی برائی اور گناہ تسلیم کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

اس ظلم کی بستی سے تو آندھی کی طرح اٹھ
اس شہر کی گلیاں خس و خاشاک سے بھر جا(۱۰۰)

طاقت اور کمزوری میں فرق یہی تو ہوتا ہے
ظلم کرنا بھی ایک ثواب اور سہنا بھی ایک گناہ(۱۰۱)

ظلم سہنے کو وہ ایک برائی کے طور پر پیش کرتے ہیں اس لیے وہ آگے بڑھ کر سماج سے جبر اور استحصال کی ہر شکل کے خاتمے کی بات کرتے ہیں۔ کیوں کہ جبر کے خلاف اگر جدوجہد کرتے ہوئے اس کا سدِباب نہ کیا جائے تو یہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے چنانچہ اقبال ساجد کہتے ہیں:

کاٹی نہیں تو اور بھی پھیلے گی شاخ جبر کی
جبر کی بات چھوڑیے ہوتی ہے حد بھی صبر کی
صبر کی بیل تو منڈھے چڑھ نہ سکی مرے خدا
دہر میں دھوم دھام سے رسم چلی ہے جبر کی(۱۰۲)

وہ وقت کی تاریکی اور ظلمت پر کہیں کہیں شکوہ کناں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اب کے برس بھی تازہ اجالوں کے ہاتھ سے
چسپاں فصیل وقت پہ ظلمت بہت ہوئی(۱۰۳)

اور کہیں وظالم معاشرے کے حق میں دلیلیں دینے والوں کے خلاف غم وغصے کا اظہار کرتے ہیں۔ کیوں کہ ایک ظالم اور جابر معاشرہ جو انسانوں پر ظلم اور استحصال کرتا ہے وہ انسان کے وجود کے لیے خطرہ ہوتا ہے۔ انسانوں میں تقسیم و تفریق پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اقبال ساجد کے ہاں صرف کرنے والوں کے ہی نفی نہیں ہے بلکہ وہ ظلم حمایت یافتہ طبقے کی بھی مذمت کرتے ہیں۔

ظالم معاشرے کی صفائی میں کچھ نہ کہہ
قاتل کے حق میں دے نہ شہادت کرائے پر(۱۰۴)

جدید کارپوریٹ کلچر میں ان تمام مسائل کے انبار میں انسان احساس زیاں اور ذات کی تنہائی کا شکار ہے۔ وہ اس بے حس و بے مروت معاشرے میں کروڑوں، لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں خود کو تنہا اور اکیلا محسوس کرتا ہے۔ وہ اس ذہنی بیماری کا شکار ہو کر شدید بے بسی اور بیچارگی کا شکار ہوتا ہے۔ سبط حسن اس کیفیت کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

"بیگانگی یا لاتعلقی (Alienation) نفسیات کی پرانی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد تشخص ذات کا زیاں ہے۔ یعنی وہ ذہنی کیفیت جس کے باعث انسان اپنے معاشرے، اپنی تہذیب حتیٰ کہ اپنی ذات سے کٹ جاتا ہے۔ وہ ہزاروں، لاکھوں کی بستی میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یارومددگار محسوس کرتا ہے۔ اس کو اپنے گردوپیش کی ہر شے اجنبی اور غیر نظر آتی ہے اور وہ معاشرے کی تمام قدروں اور تمام سرگرمیوں کو بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔"(۱۰۵)

اقبال ساجد کی شاعری میں بیگانگی کا جو تصور ملتا ہے وہ دراصل ان کی ذاتی زندگی کی محرومیوں، تلخیوں اور سماجی مسائل کے انبار کا پرتو ہے۔ وہ ایسے معاشرے میں پائے جانے والے ان تمام مسائل پر کڑھتے ہیں۔ غم وغصہ کرتے ہیں اور جب اپنی زندگی کو اور سماج کے ان مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو اس ناکامی سے وہ بے یارو مددگار محسوس کرتے ہیں اور کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگتی حتیٰ کہ اپنا گھربار، خاندان اور ذاتی زندگی بھی۔

کئی برسوں سے بچوں کا نگر اچھا نہیں لگتا
کسی کا کیا مجھے اپنا بھی گھر اچھا نہیں لگتا(۱۰۶)

اس حادثے سے بڑھ کر کیا حادثہ ہو ساجد؟
اپنے ہی گھر میں قید تنہائی کاٹتے ہیں(۱۰۷)

یہاں تک کہ وہ اپنی ذات سے بیگانہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں:

رہائی دوں کہ کھلے ظلم سے بچائے مجھے
کوئی نہیں مرے پنجے سے جو چھڑائے مجھے
میں اپنے جسم کی بوری کو ٹھوکریں ماروں
مگر یہ شغل اذیت پسند آئے مجھے(۱۰۸)

اپنی محنت کے استحصال اور ناقدری کے باعث ان کو اپنا فن اور اپنی ذات بھی کم تر دکھائی دیتے ہیں۔

تو نے جو لکھا ہے، اسے کوڑا کرکٹ ہی سمجھ
پیٹ کا دوزخ بجھا سوچوں کا ایندھن بیچ کر
میرا پیراہن پہن کر لوگ شہرت پا گئے
میں تو ننگا ہو گیا، اپنا نیا پن بیچ کر(۱۰۹)

مجموعی طور پر اقبال ساجد کی شاعری میں سماجی مسائل کو بہترین ترقی پسند انداز میں برتا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں ظالمانہ نظام سے پیدا ہونے والے ہر مسئلے کو شعور کی سطح پر پرکھنے اور جانچنے کی صلاحیت موجود ہے۔

معاشرے میں پائی جانے والی اونچ نیچ، استحصال، جبر، سماجی گھٹن، ننگ و افلاس، غربت، بھوک، سرمایہ داری اور جاگیر داری نظام کے استحصالی ہتھکنڈے، مشینی زندگی اور کارپوریٹ کلچر کے انسانی زندگی پر اثرات اور بازار یعنی مارکیٹ کی معیشت کا سماجی مسائل میں کردار، ان کی شاعری میں اہم موضوعات ہیں۔ اقبال ساجد نے انسان کی محرومیوں اور سختیوں کو شعر کی زبان عطا کی ہے۔ وہ اگرچہ خود بھی ان محرومیوں تلخیوں اور سماجی مسائل کا شکار رہے مگر اس کے باوجود وہ ایک ترقی پسند آرٹسٹ کے منصب سے نابلد نہیں ہیں۔ وہ اپنے ماحول اور سماج سے کٹ کر کسی روحانی یا داخلی واردات کا انتظار نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے سماج پر نظر دوڑاتے ہیں اور سماجی مسائل کو دیکھ کر ان سب مسائل کو شعری زبان عطا کرتے ہیں۔ یہی ایک حقیقی ترقی پسند ادیب کا منصب ہے۔

یوسف حسن کی شاعری سماجی مسائل کے تناظر میں:

ترقی پسند تحریک کے آغاز سے ہی اس تحرک کے ساتھ بہت سے نظریاتی لوگ منسلک ہوئے جنھوں نے اس تحریک کو نہ صرف نظریاتی طور پر قبول کیا بلکہ ادبی سطح پر اس تحریک کی پرورش پرداخت میں بھرپور اور توانا کردار ادا کیا۔ تحریک کی فکری بنیادیں مضبوط کیں اور آنے والے دور میں شاعروں ار ادیبوں کی ایک بہت بڑی

تعداد کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کے لیے راہنمائی کا سامان بھی فراہم کیا۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا ادب برائے زندگی کا نظریہ دیگر نظریات کی نسبت غیر معمولی طور پر مقبول ہوا۔ شاعروں اور ادیبوں نے اس نظریے کے تحت اپنے سماج کا از سر نو جائزہ لیا کیا اور سماجی حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بہت سارے ادیب اور شاعر منسلک رہے۔ کچھ نے اس تحریک کو نظریاتی سطح پر قبول کیا اور کچھ نے محض مقبول نظریے کے طور پر اپنایا۔ اس کے بحرانی دور میں اس تحریک کے خلاف شدید رد عمل آیا اور اس دور میں جن لوگوں نے اس نظریے کو محض مقبولیت کی بنیاد پر قبول کیا تھا وہ سرکاری اور حکومتی کریک ڈاؤن سے گھبرا کر اس تحریک سے یا تو کنارہ کش ہو گئے یا انھوں نے کسی دوسری تحریک میں جائے پناہ لے لی۔ مگر تحریک کے اس بحرانی دوری میں بھی کچھ لوگ ترقی پسند فکر کے ساتھ ڈٹ کر کھڑے اور ترقی پسند ادب کے لیے ساری زندگی کام کرتے رہے۔ ان سخت ترین حالات میں جب آمریت اور ریاستی سرپرستی میں تحریک کو ختم کر کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے خلاف کاروائیاں کی گئیں اور ترقی پسند ادب کے نام لیوا نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ تب بھی چند لوگ ایسے تھے جو خود کو ترقی پسند کہلوانا نہ صرف اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے بلکہ انھوں نے اس فکر کے لیے بہت سی قربانیاں بھی دیں اور فکری بحران کے دور میں بھی غیر متزلزل طور پر نظریے کے ساتھ وابستہ رہے۔

یوسف حسن نے ترقی پسند فکر کو گہرے مطالعے اور سائنسی شعور کے طور پر اپنایا تھا اس لیے وہ ساری زندگی اس نظریے کے ساتھ وابستہ رہے۔ عابد حسن منٹو ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "پروفیسر یوسف حسن صحیح معنوں میں دانشور تھے۔ وسیع مطالعہ اور نظریے کی پختگی ان کی دانشوری کے مضبوط ستون تھے۔۔ سن اسی کی دہائی کے اواخر میں سوشلسٹ دنیا اور انقلاب کی تبدیلیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اتنی بڑی تبدیلیوں نے بائیں بازو کے کئی دانشوروں اور سیاستدانوں کو نظریاتی طور پر متزلزل کر دیا۔ اس ذہنی افراتفری اور عالمی تبدیلیوں کی تنزلی کے باوجود ایسے لوگ موجود تھے جو اپنے انقلابی نظریات سے جڑے رہے۔ پروفیسر یوسف حسن ایسے ہی ثابت قدم اور باشعور دانشوروں میں شامل تھے۔"(۱۱۰)

یوسف حسن کی شاعری میں زیادہ تر جن سماجی مسائل کا تذکرہ ہے ان کا تعلق عالمی سرمایہ داری نظام کے ماڈل سے ہے۔ ان کی شاعری میں زیادہ تر جدید کانومی یعنی منڈی کی معیشت کے استحصال اور اجارہ داری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ منڈی کی معیشت اور اجارہ داری جدید یا نیو لبرل اکانومی کا ماڈل ہے۔ اس ماڈل میں مزدور طبقے کا شدید

استحصال کیا جاتا ہے۔ انسان اپنی محنت کے دام وصول نہیں کر پاتا اور نتیجتاً مزدور بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوسف حسن کی شاعری نے اس نیو لبرل اکانومی کے لیے بازار کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔

بازار کی بندگی ہے یوسف
دربار کی آن بان ہے کیا(۱۱۱)

یہ آزاد یا فری مارکیٹ اکانومی کی طاقت ہی ہے کہ بڑی سے بڑی ریاستیں اور حکومتیں بھی اس بازار کی خدائی اور اجارہ داری کے سامنے بے بس نظر آتی ہیں۔ اس لیے اس جدید اجارہ داری کے سامنے عام انسان کی تو کوئی خاص حیثیت ہی نہیں ہے۔

بازاری اس خدائی کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا کیوں کہ اس اجارہ دار معیشت میں نجی کمپنیوں کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر کے منافع کمانے کی کھلی چھوٹ دی جاتی ہے اور یوں اس کھلی چھوٹ اور استحصال کے نتیجے میں سارے معاشرے میں غربت اور بھوک ڈیرے ڈال دیتی ہے۔ انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ یوسف حسن اپنے ایک شعر میں بازار کی اس اجارہ داری کو یوں آشکار کرتے ہیں:

اے خدا دیکھ تیرے ہوتے ہوئے
ہم پہ بازار کی خدائی ہے(۱۱۲)

نیو لبرل اکانومی کے استحصال شعری اقدار میں پیش کرنے کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ نیو لبرل اکانومی کا بنیادی اصول ہی اجارہ داری اور استحصال ہے۔ بقول منصور ندیم:

> "مارکیٹ کی حکمرانی، نجی کاروبار کو حکومت کی عائد کردہ پابندیوں سے آزاد کرنا خواہ اس سے کتنا ہی سماجی نقصان کیوں نہ ہو۔ قیمتوں پر مکمل کنٹرول ۔۔۔ سرمائے اشیا اور خدمات کی نقل و حرکت کی مکمل آزادی یعنی ایسی مارکیٹ جس کو کسی قسم کے ضابطوں کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔"(۱۱۳)

بازار کی یہ اجارہ داری انسانی اور اور سماجی رشتوں کو بھی آلودہ کرتی ہے۔ یوسف حسن کے ہاں نیو لبرل اکانومی کے ان اثرات کا گہرا شعور ملتا ہے۔ وہ سماجی رشتوں پر اس کے اثر کو یوں بیان کرتے ہیں:

بازار ہی بازار دروں بھی ہیں بروں بھی
ہر رشتہ جاں رشتہ زر کس نے کیا ہے(۱۱۴)

اس نیو لبرل اکانومی کا ایک اور اندازہ دیگر قوموں کے وسائل پر بھی اجارہ داری کرنا ہے۔ ملٹائی نیشن کمپنیوں کی سامراجی ہوس کے نتیجے میں شہری دنیا کے غریب ممالک غربت کی دلدل میں مزید دھنستے رہتے ہیں۔ اپنے وسائل کے اوپر ان کا اختیار نہیں ہوتا۔ مختلف سامراجی اداروں کے ذریعے معیشت اور وسائل کو کنٹرول کر کے مقامی لوگوں کو ان کے وسائل کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

ہر کوئی آیا مرے درد کا درماں بن کر
ہر کسی نے مری دھرتی کا دفینہ چاہا
مجھ سے تفریق کیا رشتہ زر نے مجھ کو
جس نے بس میری مشقت کا خزینہ پہنچایا(۱۱۵)

یہ وہ سامراجی لوٹ مار ہے جو یوسف حسن کے بقول "دھرتی کے دفینوں" اور "مشقت کے خزینوں" کا استحصال کرتی ہے اور یہی وہ رشتہ زر ہے جو ہر رشتہ انسانی کے درمیان تفریق و تقسیم کا سبب بنتی ہے۔ یوسف حسن اس لیے بازار کی اس لیے تقسیم رشتہ زر سے اکتاہٹ کا بھی اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ بھی نہ مجھے بیعت بازار میں چاہے
میں بھی نہ کبھی سایہ زر میں اسے دیکھوں(۱۱۶)

وہ زر کے سائے کے اس تسلط سے بالاتر ہو کر خالص انسانی بنیادوں پر انسانیت کے تعلق کی بات کرتے ہیں۔ یہ دراصل ایک خوب صورت اور بہترین معاشرے کا خواب ہے جہاں ہر انسان زر یعنی دولت کی غلامی سے آزاد ہو کر انسانی اعلا اخلاقی قدروں کے تحت سماجی رشتوں کو قائم کریں۔ مگر دوسری طرف ایک اہم سماجی حقیقت یہی ہے کہ اس گرم بازاری میں اور تحویل زر میں لوگ اپنی ذات کیا عقیدے تک بھلا دیتے ہیں:

یوسف ایسے کھوئے ہم بازار کے اسرار میں
آخر اپنی ذات بھی تحویل زر میں آگئی(۱۱۷)

لوگ تو لوگ عقیدے بھی پگھل جاتے ہیں
تم نے دیکھی ہی نہیں گرمی بازار ابھی(۱۱۸)

سماجی گھٹن یوسف حسن کی شاعری میں ایک اہم موضوع ہے۔ ہمارے ملک میں جس سماجی گھٹن کی فضا ہے اس میں بعض اوقات سانس لینا بھی محال ہوتا ہے۔ یوسف حسن اس سماجی گھٹن کو شاعری کے پیرائے میں یوں بیان کرتے ہیں:

سائے یہ کیسے آئے ہیں دیوار و در کے بیچ
جائے اماں کہیں بھی ہیں شہر بھرتے بیچ(۱۱۹)

صحرا میں اک سناٹے سے سہمے سہمے رہتے تھے
شہر میں اپنی آوازوں کی ویرانی سے ڈرتے تھے(۱۲۰)

روشنی اور آزادی پر جب قدغن لگادی جاتی ہے تو تیرگی اور ظلمت کے ساتھ ساتھ گھٹن اس سماج اور معاشرے کا مقدر بن جاتی ہے۔

روشنی کے رخ کی جو تکفیر کردی جائے گی
تیرگی ہر روح کی تقدیر کر دی جائے گی
ایک کمرے کی گھٹن محفوظ رکھنے کے لیے
ساری گلیوں کی ہوا زنجیر کر دی جائے گی(۱۲۱)

وہ اس گھٹن کی وجوہات کا ادراک بھی رکھتے ہیں اور خوب صورت جمالیاتی پیرائے میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

کوئی پہرہ نہیں فصیلوں پر
شہر اندر سے ہے حراست میں(۱۲۲)

اس گھٹن کی فضا میں بعض اوقات انسان کا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے تازہ ہوا درکار ہوتی ہے۔ وہ اس گھٹن سے آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ساری گلیوں میں دھواں گھومتا ہے
گھٹ نہ جائے دم عیسیٰ دیکھو(۱۲۳)

چہرہ، دھواں اور زنجیر کے الفاظ یوسف حسن کے ہاں سماجی گھٹن کی تشریحی علامتیں ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعے وہ ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی گھٹن کو شعر کے ذریعے بیان کرتے ہیں:

ایک ہی زنجیر تھی اس پار سے پار تک
کج روی کا کوئی وقفہ ہی کہاں رکھا گیا(۱۲۴)

یوسف حسن کی شاعری میں ایک عام انسان کی زندگی کی احساس محرومیوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہ احساس محرومی یا زندگی سے شکوہ بنیادی طور پر اس نظام زر کے خلاف رد عمل ہے اس رد عمل میں یوسف حسن زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کو شعری زبان عطا کر کے ایک حقیقی اور سماجی آرٹسٹ ہونے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

ہم اپنی حقیقت کے مساوی نہیں ملتے
جیون ہمیں جینے کے برابر نہیں ملتا(۱۲۵)

رشتہ زر میں منسلک طبقاتی سماج کی بنیادی خامی ہی یہی ہوتی ہے کہ اس نظام زر سے کوئی بھی انسان مطمئن نہیں ہوتا۔

اس ہات کی مٹھی میں تو سورج تھے مقید
اک ہاتھ شعاؤں کی گدائی کے لیے تھا(۱۲۶)

مجھ سے تفریق کیا رشتہ زر نے مجھ کو
جس نے بس میری مشقت کا خزینہ چاہا(۱۲۷)

اس بے اطمینانی اور اضطراب سے سماج کا ہر چہرہ ملال زدہ ہوتا ہے۔ ہر چہرے پہ زندگی کی محرومیوں کی کہانی درج ہوتی ہے۔

میرا کھونا بھی یہی ہے مرا ہونا بھی یہی
زندگی تیرے خدوخال میں بھر آیا ہوں

کبھی مجھ سے بھی لپٹ کر کوئی پوچھے یوسف
کن خرابوں میں بھٹکتا ہوا گھر آیا ہوں(۱۲۸)

یوسف حسن کے ہاں ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف شدید رد عمل ملتا ہے۔ وہ معاشرے کے اس طبقے کے خلاف جو ظلم و استحصال کو روا رکھتا ہے اور اپنے استحصال کو جاری رکھنے کے لیے مختلف حیلے بناتا ہے۔ اس کو اپنی شاعری کے توسط سے آشکار کرتے ہیں:

بندوقیں اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں شکاری
اور شور پرندوں کی رہائی کے لیے تھا
فرعون ہی غرقاب کیا نیل میں تو نے
فرعون ہی پھر ہم پہ خدائی کے لیے تھا(۱۲۹)

یوسف حسن اس استحصالی کو نہ صرف پہچانتے ہیں بلکہ وہ گھر اور زنداں کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے اس کو یوں طنز کا نشانہ بناتے ہیں:

یہ کس کی مصلحت سے گھر ہمارا
کبھی زنداں کبھی بارہ دری ہے(۱۳۰)

اسی مصلحت کوشی کے نتیجے میں ہر بار قربانی غریب اور محنت کش عوام کو ہی دینی پڑتی ہے اور ہر بار حاکم محکوم کے خون سے ہولی کھیلتا ہے۔

رہ رہ کے قتل ہوتا چلا آ رہا ہوں میں
دھبے مرے ہی خون کے ہیں سارے مکان پر(۱۳۱)

عصری زندگی میں جبر و استحصال ناانصافی، منافقت، جھوٹ، سماجی گھٹن کے خلاف یوسف حسن کے ہاں رد عمل ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے ہاں عصری زندگی الجھنوں، پریشانیوں، بے چینی، بے یقینی، اضطراب اور اس خاص کیفیت اور ماحول سے عام انسانوں کی بے بسی اور بے نوائی کا بھی اظہار ہوتا ہے اور کہیں کہیں وہ زندگی کے اس تلخ اور ذلت آمیز رویے کا اظہار کرتے ہیں:

ذلتیں اپنا مقدر تو نہیں تھیں یوسف
ہم نے کس موت کے معیار پر جینا چاہا(۱۳۲)

یوسف حسن کی شاعری میں عصری زندگی کے مسائل طبقاتی عدم مساوات، جبر و استحصال، مارکیٹ اکانومی یعنی نیولبرل معیشت سے پیدا ہونے والے مسائل کو زیادہ تر شعری زندگی کے مسائل کا گہرا ادراک ملتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے غلبے کی وجہ سے بدلتی ہوئی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا مشاہدہ ہو یا رشتہ زر کے بندھن میں بندھے جدید انسانی معاشرے کے سماجی رشتوں کی گراوٹ اور ٹوٹ پھوٹ کا بیانیہ ہو یوسف حسن کے ہاں ان عصری مسائل کو بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یوسف حسن کی شاعری کو اگر سماجی مسائل کے تناظر میں پرکھا جائے تو ان کی شاعری میں ترقی پسندی محض جامد نظریے کے طور پر اظہار نہیں کرتی بلکہ وہ ترقی پسندی کو ایک متحرک اور عصری زاویوں میں ڈھلتا ہوا نظریہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے وہ دور جدید کے اس اہم ترقی پسند ادیب کے طور پر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ آج کی زندگی کے مسائل کو سرمایہ داری نظام کے نئے استحصالی ہتھکنڈوں کی وجہ قرار دیتے ہوئے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری جدید دور کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

تقابل:

گزشتہ اوراق میں تنویر سپرا اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شاعری میں سماجی مسائل کے اظہار پر گفتگو ہوئی ہے۔ ترقی پسند نقطہ نظر سے کوئی ادیب اگر اپنے ارد گرد کے خارجی ماحول اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر اور الگ رہتا ہے تو وہ درحقیقت ایک سماجی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ادیب کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے سماج کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرے۔ اس معاشرے میں پائے جانے والے مسائل کو نہ صرف اجاگر کرے بلکہ اپنی شاعری یا ادب کے ذریعے اس کے خلاف نئے راہ عمل کا تعین بھی کرے۔ اختر حسین رائے پوری کے بقول:

> "صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقہ سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ اس کے دل میں خدمت خلق کا جذبہ ہونا چاہیے کیوں کہ ادب پیغمبری کی طرح خود غرضی کا متقاضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پیشہ ور! ماضی حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لیے ضروری ہے تاکہ اس کی دردمندی رائیگاں نہ جائے وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے۔ پھر زندگی کو اس وقت سمجھا جا سکتا ہے۔"(۱۳۳)

اسی لیے وہ زندگی کو ایک مکمل اکائی قرار دیتے ہیں اور ادب کو زندگی سے الگ کسی اور خانے میں تقسیم نہیں کرتے۔ وہ ادب کو زندگی کا ہی حصہ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ادب جب زندگی کے مسائل سے الگ یا بیگانہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایک حقیقی ادیب کو زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے۔ زندگی کے مسائل کے اظہار کے ساتھ ساتھ اسے ان کے حل کی راہنمائی بھی کرنی چاہیے۔ غربت اور محکوم لوگوں کے حال زار سے بے حس نہیں ہونا چاہیے۔ اس ادیب میں احساس گہرائی اور گیرائی ہونی چاہیے جو اس کو سماج اور سماجی مسئلوں سے منسلک رکھے۔

> "احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حال زار ہمیں بے حس کیسے رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے

بے کاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو حاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی
کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو وہ کیا کہے کس سے کہے اور کس طریقے سے کہے۔"(۱۳۴)

اسی لیے ایک ادیب سماجی مسائل سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر داخلی یا محض روحانی واردات کے انتظار اور تحریک کے نتیجے میں ادب کی تخلیق کرتا ہے تو وہ ایک اہم سماجی عہدے سے بد دیانتی کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری جو کہ ترقی پسند ادب کے سرخیل اول ہیں ان کی طرح مجنوں گورکھپوری بھی ادیب کو سماج کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں:

"ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا اور ادب ترک یا تپسیا کی پیداوار نہیں ہے۔ ادیب اس طرح ایک مخصوص ہئیت اجتماعی ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے۔ جس طرح کا کوئی دوسرا فرد اور ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اس طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہماری دوسری حرکات و سکنات۔"(۱۳۵)

ترقی پسند ادب کے ان معماروں کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط کی روشنی میں جب ہم تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف کا تقابلی سطح پر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ تینوں شعرا ترقی پسند ادب کی تعریف پر پورا اترتے ہیں اور اپنے سماج کے مسائل کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں۔

تنویر سپرا کی شاعری میں غربت، افلاس، ننگ، بھوک، سماجی جبر، گھٹن، استحصال آمریت، ناانصافی، مہنگائی، جہالت سمیت مشینی زندگی سے پیدا ہونے والی اکتاہٹ، بے چینی، اضطراب اور انسانی نفسیات پر اثرات کو بہت بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ تنویر سپرا کی شاعری میں محنت کے استحصال آجر اور اجیر یعنی سرمایہ دار اور مزدور کے استحصالی رشتے اور کارپوریٹ کلچر کے نئے معاشی استحصال اوور ٹائم اور شفٹوں میں منقسم مزدور کے استحصال کی احسن انداز میں ترجمانی کی گئی ہے۔ وہ سماج کا گہرا ادراک اور شعور رکھتے ہیں۔

جب کہ اقبال ساجد کی شاعری محکوم و مجبور اور غربت کے ہاتھوں ستائے ہوئے لوگوں کا المیہ ہے۔ ان کی شاعری زندگی کی تلخیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ سماج میں پائی جانے والی غربت، افلاس، ننگ، بھوک، مہنگائی، بیماری، بھیک، جسم فروشی، کارپوریٹ کلچر کے استحصال اور اس ساری صورت حال سے سماج اور سماجی رشتوں کی تباہی، سماجی گھٹن، منافقت، ریاکاری، تنگ دستی، بے حسی اور احساس محرومی کو وہ اپنے شعروں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اقبال ساجد کی شاعری دراصل ایک مفلس اور غریب انسان کا ظالم اور جابر نظام کے خلاف احتجاج ہے۔ کارپوریٹ کلچر کی یلغار، رشتوں کی منافقت اور غریب انسان کا اس سماج میں بیگانگی کا شکار ہو کر جرائم کی طرف راغب ہونا بھی ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ہے۔

یوسف حسن کی شاعری میں جن سماجی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے وہ دراصل نیو لبرل اکانومی کا شاخسانہ ہے۔ وہ سرمایہ داری نظام کے جدید معاشی ماڈل کی تفہیم کرتے ہوئے انسانی معاشرے پر کارپوریٹ سیکٹر اور بازار یعنی مارکیٹ کے بڑھتے ہوئے استحصالی اثرات کو بہت جاندار اسلوب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یوسف حسن کے ہاں بازار کے لفظ کی تکرار مارکیٹ اکانومی یعنی منڈی کی معیشت کے یلغار کا اظہار ہے جہاں بازار انسانی رشتوں اور اخلاقی قدروں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور انسان اس بازار کے مقابلے ایک بے جان چیز بن جاتا ہے۔ حقیقت میں اس بازار میں انسان بھی اس لبرل اکانومی کے اصول پر ایک جنس یعنی کموڈٹی ہی ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر تینوں شعرا کے ہاں کہیں کہیں سماجی مسائل کے حوالے سے اشتراکات بھی ملتے ہیں۔ مگر تینوں شعرا نے اپنے دور کے عصری مسائل کو اپنے اپنے اسلوب اور شعور کے مطابق برتا ہے۔ اقبال ساجد اور تنویر سپرا کے ہاں ان کی ذاتی زندگی کے تلخ تجربات بھی ان کے اشعار میں نظر آتے ہیں۔ جب کہ یوسف حسن کے ہاں سماج کا گہرا شعوری مطالعہ ان کے اشعار کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مجموعی طور پر تینوں شعرا ترقی پسند ادب کے جدید اور نئے ترجمان ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ صادق، محمد۔ترقی پسند اردو غزل کا آغاز و ارتقا (نئی دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۱۲) ۱۰۰

۲۔ یاور، یعقوب۔ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸) ۳۶۳ ۳۶۴

۳۔ یوسف حسن، مضمون مشمولہ لفظ کھردرے (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹) ۱۹۶

۴۔ سپرا، تنویر۔ لفظ کھردرے۔(جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶) ۸۷

۵۔ ایضاً، ص ۹۰

۶۔ ایضاً، ص ۹۶، ۹۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۸۔ ایضاً ص ۱۶۶

۹۔ ایضاً ص ۸۲ , ۸۳

۱۰۔ ایضاً، ۷۸

۱۱۔ ایضاً، ۹۱

۱۲۔ ایضاً، ۱۷۷

۱۳۔ ایضاً، ۱۴۰

۱۴۔ ایضاً، ۵۳

۱۵۔ ایضاً، ۶۴

۱۶۔ ایضاً، ۶۵

۱۷۔ ایضاً، ۷۶ ،۷۷

۱۸۔ ایضاً، ۱۰۱

۱۹۔ ایضاً، ۲۹، ۳۰

۲۰۔ ایضاً، ۶۹

۲۱۔ ایضاً، ۷۰

۲۲۔ ایضاً، ۸۱

۲۳۔ ایضاً، ۸۴

۲۴۔ ایضاً،۱۶۳

۲۵۔ ایضاً، ۷۸

۲۶۔ ایضاً، ۱۲۳

۲۷۔ ایضاً، ۴۲

۲۸۔ ایضاً،۸۶

۲۹۔ ایضا،۳۳

۳۰۔ ایضاً، ۱۲۹

۳۱۔ ایضاً، ۷۴

۳۲۔ ایضا، ۸۸

۳۳۔ ایضا، ۸۹

۳۴۔ ایضا، ۵۵

۳۵۔ حسن،سبط۔موسی سے مارکس تک (کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۴ ) ۲۷۷

۳۶۔ سپرا، تنویر۔ لفظ کھردرے (جہلم:بک کارنر،۲۰۱۶ )۷۴،۷۵

۳۷۔ ایضاً، ۷۵

۳۸۔ ایضاً، ۹۹

۳۹۔ ایضاً،۹۶

۴۰۔ ایضاً، ۸۹

۴۱۔ حسن،سبط۔ موسی سے مارکس تک (کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۴ )۲۷۷

۴۲۔ سپرا، تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم:بک کارنر،۲۰۱۶)۴۳

۴۳۔ ایضاً،۴۴

۴۴۔ ایضاً،۴۴

۴۵۔ ایضاً،۱۴۲

۴۶۔ ایضاً،۱۳۵

۴۷۔ ایضاً،۱۸۰

۴۸۔ ایضاً،۷۲

۴۹۔ ایضاً،۱۴۸

۵۰۔ یاور،یعقوب۔ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری (کراچی:سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸) ۸۲

۵۱۔ سپرا،تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم:بک کارنر،۲۰۱۶)۱۲۵

۵۲۔ ایضاً،۱۲۵

۵۳۔ ایضاً، ۳۰

۵۴۔ ایضاً،۳۰

۵۵۔ ایضاً،۸۴

۵۷۔ ایضاً،۱۰۷

۵۸۔ جعفری،جواز۔ایک ناراض خو شاعر(مشمولہ کلیات اقبال ساجد۔لاہور:جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴) ۱۷

۵۹۔ ساجد،اقبال۔تکمیل (اسلام آباد:بدلتی دنیا پبلی کیشنز،۲۰۱۷)۱۵

۶۰۔ ایضا،۹۷

۶۱۔ ایضا،۱۷۵

۶۲۔ ایضا،۹۰

۶۳۔ حسن،سبط۔ موسی سے مارکس تک (کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۴ ) ۲۸۰

۶۴۔ ساجد،اقبال۔تکمیل (اسلام آباد:بدلتی دنیا پبلی کیشنز،۲۰۱۷ ) ۲۰۰, ۲۰۱

۶۵۔ ایضا، ۲۲۵

۶۶۔ ایضا، ۱۵،۱۶

۶۷۔ ایضا، ۲۲

۶۸۔ ایضا، ۶۱

۶۹۔ ایضا، ۸۳

۷۰۔ ایضاً، ۲۰۰

۷۱۔ ایضاً،۲۰۱

۷۲۔ ایضاً،۱۷

۷۳۔ ایضاً،۲۱

۷۴۔ ایضاً،۱۰۰

۷۵۔ ایضاً، ۱۳۲

۷۶۔ ایضاً،۱۷۵

۷۷۔ ایضاً،۲۰۰

۷۸۔ ایضاً،۲۰۲

۷۹۔ ایضا، ۲۰۵

۸۰۔ ایضاً،۲۰۷

۸۱۔ ایضاً،۳۴

۸۲۔ ایضاً،۶۶

۸۳۔ ایضاً، ۹۸

۸۴۔ ایضا، ۱۱۲

۸۵۔ ایضا، ۱۱۸

۸۶۔ ایضاً،۱۳۹

۸۷۔ ایضاً، ۱۴۷

۸۸۔ ایضاً،۱۶۶

۸۹۔ ایضاً، ۱۷۳

۹۰۔ ایضاً،۲۱۵

۹۱۔ جعفری، جواز۔ایک ناراض خو شاعر مشمولہ کلیات اقبال ساجد (لاہور:جنگ پبلشرز،۱۹۹۴) ۲۴

۹۲۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد:بدلتی دنیا پبلی کیشنز،۲۰۱۷ )

۹۳۔ ایضاً، ۶۶

۹۴۔ ایضاً،۷۳

۹۵۔ ایضاً، ۱۴۹

۹۶۔ ایضاً، ۱۷۳

۹۷۔ ایضاً، ۹۴

۹۸۔ ایضاً، ۹۴

۹۹۔ ایضا، ۱۱۴

۱۰۰۔ ایضاً،۵۷

۱۰۱۔ ایضاً،۹۵

۱۰۲۔ ایضاً، ۱۱۹, ۱۲۰

۱۰۳۔ ایضاً،۱۸۶

۱۰۴۔ ایضاً،۲۱۳

۱۰۵۔ حسن،سبط۔موسی سے مارکس تک (کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۱۴ ) ۲۶۹

۱۰۶۔ ساجد،اقبال۔تکمیل(اسلام آباد:بدلتی دنیا پبلی کیشنز،۲۰۱۷ )۳۳

۱۰۷۔ ایضاً،۸۸

۱۰۸۔ ایضاً، ۱۰۴

۱۰۹۔ ایضاً، ۲۱۵

۱۱۰۔ منٹو،عابد حسن۔پیش لفظ اے دل اے دریا (راولپنڈی:رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۱۹) ۹،۸

۱۱۱۔ حسن،یوسف۔اے دل اے دریا (راولپنڈی:رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۱۹ ) ۱۱۸

۱۱۲۔ ایضا، ۱۱۱

۱۱۳۔ ندیم،منصور۔نیو لبرل ازم کیا ہے؟ (مکالمہ۔مارچ۲۱۰۸ء،)

۱۱۴۔ حسن،یوسف۔اے دل اے دریا (راولپنڈی:رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۱۹ ) ۱۱۸

۱۱۵۔ ایضاً، ۱۳۰

۱۱۶۔ ایضاً،۱۳۸

۱۱۷۔ ایضاً، ۱۴۰

۱۱۸۔ ایضا، ۱۴۳

۱۱۹۔ ایضاً،۳۵

۱۲۰۔ ایضاً، ۵۳

۱۲۱۔ ایضاً، ۸۷

۱۲۲۔ ایضاً، ۱۰۰

۱۲۳۔ ایضاً، ۱۲۰

۱۲۴۔ ایضاً، ۱۳۵

۱۲۵۔ ایضاً، ۵۷

۱۲۶۔ ایضاً، ۶۹

۱۲۷۔ ایضاً، ۱۳۰

۱۲۸۔ ایضاً، ۱۴۵،۱۴۶

۱۲۹۔ ایضاً، ۷۰

۱۳۰۔ ایضاً،۷۷

۱۳۱۔ ایضاً، ۹۰

۱۳۲۔ ایضاً،۱۳۰

۱۳۳۔ رائے پوری، اختر حسین۔ ادب اور انقلاب (حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳) ۳۴

۱۳۴۔ ایضاً، ۱۲

۱۳۵۔ گورکھپوری، مجنوں۔ ادب اور زندگی (گورکھپور: ایوان اشاعت، س۔ن) ۲

# باب سوم

## طبقاتی و سماجی شعور کے تناظر میں منتخب شعرا کا جائزہ: تقابلی مطالعہ

ادب ایک سماجی عمل ہے اس سماجی عمل میں ایک ادیب اپنے ماحول اور خارج سے مکمل طور پر جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس ماحول کے اثرات، روایات اخلاقیات سمیت ہر چیز کے اثرات کو قبول کرتا ہے۔ اس لئے ایک ادیب اپنے خارجی ماحول میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتا ہے۔ وہ ان تبدیلیوں سے اثرات قبول کرتا ہے۔ یہی اثرات اس کے شعور کا حصہ بن کر سماجی شعور کی تشکیل کرتے ہیں۔ ادب ایک معاشرتی سرگرمی ہے۔ اس لیے وہ اس سماج میں بسر ہونے والی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لیے ایک حقیقی ادیب اپنے سماج اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایک ادیب جس سماج کا رکن ہوتا ہے وہ اس سماج میں وقوع پذیر سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی تبدیلیوں کا اثر قبول کرتا ہے اور یوں سماج میں ہونے والی یہ تبدیلیاں ایک ادیب کے سماجی شعور کو تشکیل دیتی ہیں۔ ادیب ایک حساس انسان ہوتا ہے۔ وہ عام انسان کی نسبت سماج کا تجزیہ و مطالعہ بہت گہرے مشاہدے کے ساتھ کرتا ہے۔ اس لیے ایک ادیب جس قدر اپنے ماحول اور خارجی دنیا کا گہرا شعور رکھتا ہو گا۔ اس کا سماجی شعور اتنا ہی بلند اور اعلیٰ ہو گا اس لئے ایک ادیب کو اپنے سماج سے وابستگی رکھنی چاہیے اس صورت میں وہ اعلیٰ سماجی شعور کا حامل ہو سکتا ہے۔ جب وہ اپنے سماج کے مسائل اور اس میں ہونے والے واقعات کے اثرات کا تجزیہ و مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں سماجی شعور سماجی آگہی سے عبارت ہے بقول محمد افضل بٹ:

> "سماجی شعور آگاہی اور سماجی پہچان سے عبارت ہے۔ یہاں وہ تغیر و تبدل اہم ہے جو ہمہ وقت کسی سماج میں جاری رہتا ہے اور زندگی کے نئے رخ متعین کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سماج کے عمومی و خصوصی رویے اور منفی اور مثبت سطح پر اس کے انفرادی زاویوں سے آگاہی بھی سماجی شعور کے دائرے میں آتی ہے۔"(۱)

سماجی شعور کی نسبت طبقاتی شعور خالصتاً مارکسی اصطلاح ہے۔ اگرچہ سماجی شعور اور طبقاتی شعور کا گہرا تعلق ہے۔ سماجی شعور عوامی معاشرتی مسائل اور معاشرے کے بارے میں علم و آگہی کا تصور ہے تو طبقاتی شعور بنیادی طور کسی معاشرے کے تضادات کی پہچان کا نام ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی طبقاتی شعور کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "دنیا میں امیر اور غریب با الفاظ دیگر استحصال کرنے والے اور استحصال کا شکار ہونے والے طبقوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے اور اس کے اسباب اور عوامل اور نتائج و عواقب کا کسی نہ کسی درجے میں احساس یا ادراک اشتراکی مصنفین کی اصطلاح میں طبقاتی شعور کہلاتا ہے۔"(۲)

طبقاتی معاشرے میں جہاں انسان تقسیم کا شکار ہوں اور امیر اور غریب کی اس تقسیم کی وجہ سے معاشرے میں ہر قسم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے میں ایک ادیب کی ذمہ داری اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایک طبقاتی شعور سے ادیب معاشرے میں پائے جانے والے معاشی و سماجی طبقات کے بارے میں آگاہی رکھتا ہے۔ وہ معاشرے میں پائے جانے والی اس تقسیم کی بنیادی وجوہات کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ طبقاتی شعور کے لیے تاریخ میں سماج کے ارتقا طبقات کی تاریخ ان کا تاریخی پس منظر اور عصری زندگی میں ہمہ گیر طبقاتی شعور کا ہونا ضروری ہے۔ طبقاتی شعور کے لیے طبقات کا علم ہونا ضروری ہے۔ سماج جن دو بنیادی طبقوں میں تقسیم ہے۔ اس کے شعور کے بغیر طبقاتی شعور نمو نہیں پا سکتا۔ بقول ریاض جاوید:

> "طبقات کیا ہیں؟ اس کا جواب کو ہر سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا بڑی آسانی سے دے سکتا ہے ہر طبقات سرمایہ پرست سماج میں دو سماجی طبقے ہیں۔ ایک وہ طبقہ ہے جو ذرائع پیداوار کا مالک ہے۔ اسے سرمایہ دار طبقہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ پیداوار کا ذمہ دار ہے لیکن ذرائع پیداوار مثلاً آلات اور مشینری وغیرہ اس کی ملکیت نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ دست و بازو کی قوت یعنی محنت فروخت کرتا ہے۔ یہ محنت کش طبقہ کہلاتا ہے۔"(۳)

طبقاتی شعور کا تعلق بنیادی طور پر طبقاتی معاشرے سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ ایک ادیب کا طبقاتی شعور معاشرتی طبقاتی تقسیم اور اس کے پس پشت محرکات سرمایہ داری نظام کی چیدہ دستیوں استحصالی ہتھکنڈوں کا گہرا ادراک رکھتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے سماج کا شعور رکھتا ہے اور اس سماجی شعور کے تعاون سے طبقاتی شعور حاصل کر کے ایک غیر طبقاتی سماج کو بھی اس خواب کی تعبیر دکھاتا ہے۔ بقول انور پاشا:

> "تاریخ طبقاتی کشمکش کا نام ہے اور یہ کشمکش شروع سے جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک غیر طبقاتی سماج کا قیام عمل میں نہیں آتا۔"(۴)

اس لیے ایک ادیب کسی بھی سماج کا ایک اہم فرد ہوتا ہے۔ عام انسانوں کی نسبت اس پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسے طبقاتی معاشرے کے مسائل کا ادراک ان مسائل کی وجہ اور حل کا بھی ادراک ہونا چاہیے اس لیے وہ اپنے سماج سے جس قدر زیادہ جڑے گا اسی کا سماجی اور طبقاتی شعور بھی اس سماج کی درست عکاسی کرے گا ایک ادیب کے تخلیقی شعور کی بنیادیں اس وقت گہری اور مضبوط ہو سکتی ہیں جب اس کا سماجی و طبقاتی شعور اسی معاشرے میں پیوست ہو۔ وہ مخلوق اور مظلوم طبقات ہم نوا اور ہم درد ہو، اس لیے ایک ادیب کا سماجی و طبقاتی شعور اس سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے ادب کو واسطہ بناتے ہوئے سماجی و طبقاتی مسائل کو اجاگر کرتے زندگی کی حقیقتوں

سے آنکھیں چرانے کے بجائے ان کا مقابلہ کرے اور سماج کی بقاء کے لئے اور عوام کے شعور کے لئے اپنا کردار ادا کرے۔

طبقاتی و سماجی شعور ادراصل اپنے ارد گرد کے ماحول کے سماجی، سیاسی، ثقافتی، تہذیبی، معاشی مسائل کی آگہی ہے۔ ان مسائل میں پستی ہوئی محکوم عوام کی دادرسی اس کی ترجمانی کرنا ایک ادیب کا اولین فرض ہے۔ طبقاتی اور سماجی شعور کے ذریعے ہی زندگی کی حقیقتوں کو جانا جاسکتا ہے اور عدم مساوات، معاشرتی تفریق کے خلاف عوامی شعور کو متحرک کرکے ایک غیر طبقاتی سماج کا قیام کرنا ہی طبقاتی و سماجی شعور کا فریضہ ہے۔

ترقی پسند ادب سے وابستہ ادیبوں کے سماجی اور طبقاتی شعور کا گہرا احساس ملتا ہے۔ بالخصوص اردو شاعری میں شعرا کے طبقات کے شعور کا ادراک بہت گہرا ہے۔ ابتدائی زمانے میں جوش، فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین اسرار الحق مجاز، کیفی، جانثار اختر ظہیر کاشمیری، احسان دانش ساحر لدھیانوی نے اپنی شاعری کے ذریعے سماجی حقیقت نگاری اور طبقاتی شعور کو اجاگر کیا۔ بعد ازاں تحریک کے خاتمے کے بعد بحرانی دور میں بھی شعرا کے ہاں انفرادی سطح پر گہرے سماجی مطالعے اور طبقاتی شعور کے ذریعے اپنے معروضی اور عصری مسائل کا تخلیقی شعور ملتا ہے اور ترقی پسند شاعروں نے اپنے دور کے سماجی صورت کی بہترین ترجمانی کی:

> "ترقی پسند شاعروں نے سماجی صورت حال کی صرف ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ اسے بدلنے پر بھی زور رہا۔۔۔ سائنٹیفک بنیادوں پر ان کی طاقتوں کی نشان دہی کی جو سماج کو بدلنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ یہ کام اس سے پہلے شاعروں نے نہیں کیا تھا۔ ترقی پسندوں نے ہماری شاعری کا رشتہ قومی اور عوامی تحریکوں کے علاوہ بین الاقوامی تحریکوں سے جوڑا۔ ایک نئی انسانی اخوت اور نئی عالمی یک جہتی کا تصور انھوں نے دیا"۔(۵)

ترقی پسند تحریک کا یہ سفر تحریک کے خاتمے کے بعد بھی جاری رہا۔ بعد میں آنے والے شاعروں کے ہاں بھی پختہ سماجی و طبقاتی شعور ملتا ہے۔ جس کے ذریعے انھوں نے بدلتے ہوئے سیاسی و معاشی حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کی ترجمانی کی۔ تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن اردو کے ترقی پسند فکر کے جدید نمائندے ہیں۔ ان کے ہاں اس ترقی پسندی فکر سے سماجی اور طبقاتی شعور کا گہرا ادراک ملتا ہے۔ ذیل میں ان تینوں شعرا شاعری کا طبقاتی و سماجی شعور کے تناظر میں جائزہ لیا جائے گا۔

## تنویر سپرا کے ہاں طبقاتی و سماجی شعور:

تنویر سپرا کی شاعری کا سماجی اور طبقاتی شعور زندگی کی کشمکش، ناسازگار حالات، غربت، مفلسی، انسانیت کی توہین، سرمایہ داری نظام، لوٹ کھسوٹ اور مزدور طبقے کے مسائل سے پیدا ہوتے ہیں۔

تنویر سپرا کے طبقاتی اور سماجی شعور کے گہرے مشاہدے کی ایک خاص وجہ ان کا "مزدور طبقے" سے تعلق رکھنا ہے۔ وہ ایک مزدور کے بیٹے تھے۔ بچپن میں والدین کو مشقت کرتے دیکھا اور لڑکپن تک پہنچتے پہنچتے وہ عمومی مزدور خاندان کے بچوں کی طرح خود بھی مزدور بن چکے تھے۔ لڑکپن میں ہی آبائی علاقے اور رشتے داروں سے دور روزگار کے سلسلے میں کراچی چلے گئے۔ بعد ازاں جہلم میں ایک تمباکو بنانے والی مِل میں بھی کام کرتے رہے۔ بچپن کی یہ مشقت اور سماجی حالات ان کے شعور اور فکر پر گہرے اثرات مرتب کر رہے تھے۔ یوسف حسن سپرا کے بارے میں اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "پاکستان پر پہلی فوجی آمریت کو بمشکل ایک سال ہوا تھا اور جمہوریت پسند اور عوام دوست سیاسی اور ادبی تحریکیں اور تنظیمیں زیر عتاب تھیں۔ تنویر سپرا اسی دور میں مزدور تحریک سے باقاعدہ اور عملاً وابستہ ہوا۔ جس سے اس کے طبقاتی اور جمہوری فکر کو جدت ملی۔"(۶)

یہی وہ سماجی اور معروضی حالات تھے جن کے زیر سایہ تنویر سپرا کے سماجی اور طبقاتی شعور نے جد حاصل کی۔ سپرا اپنے سماج کا مکمل ادراک رکھتے تھے۔ اس لیے جس نظام کے خلاف وہ اپنی شاعری میں بر سرپیکار نظر آتے ہیں اس کے خلاف وہ عملی سطح پر بھی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ جمہوریت پسند آدمی تھے اور آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے والے ادیبوں میں سے ایک تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز ایک اہم سماجی مسئلے کو بیان کرتی نظم "بھوک" سے ہوتا ہے یوسف حسن لکھتے ہیں:

> "جمہوریت کے ساتھ جدید محنت کش تنویر سپرا نے بھی سیاست اور شاعری کے شعبوں میں بیک وقت قدم رکھا۔ اس نے اپنی پہلی نظم بھوک کے موضوع پر لکھی گویا اس کی شاعری کا آغاز ہی اپنے شخصی اور طبقاتی تجربے کے حقیقت پسندانہ اظہار سے ہوا۔"(۷)

یہ شخصی اور ذاتی تجربہ دراصل تنویر سپرا کی شاعری کو طبقاتی شعور فراہم کرتا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں اپنے طبقے یعنی مزدور محنت کشوں کی جاندار ترجمانی ملتی ہے اور وہ سرمایہ داری نظام کے جبر اور استحصال کے خلاف اپنے شعروں میں رد عمل دیتے ہیں۔

تنویر سپرا سرمایہ داری نظام کے جبر اور استحصال کا طبقاتی شعور رکھتے ہیں۔ اور تخلیقی سطح پر اس کا اظہار بہت عمدہ طریقے سے کرتے ہیں۔ انھیں اپنی محنت کا استحصال کرنے والے طبقے کا شعور ہے۔ لہٰذا وہ ایک محنت کش کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہوتے لکھتے ہیں:

جتنا بڑھیا مال بناؤں لے جائے زردار
اپنا سینہ گھٹیا سگریٹ سے پھونکوں سے دن رین
بَیر، وہسکی، بنگلہ، کاریں ، سیٹھوں کی جاگیر
میری قسمت آہیں آنسو نالے چیخیں، بین(۸)

مندرجہ بالا شعر میں طبقاتی سماج کے دو طبقات کی زندگیوں کی کہانی ہے ایک طبقہ مزدوروں اور محنت کشوں کا ہے جو اپنی محنت سے سماج کے پیداواری عمل میں شریک ہوتے ہیں مگر اس پیداوار سے حاصل ہونے والا منافعے میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا پیداوار کا یہ حصہ اور "بڑھیا مال" سرمایہ دار لے اڑتا ہے اس طرح معاشرہ طبقاتی تفریق کا شکار ہوتا ہے یہی طبقاتی تفریق سماج میں سرمایہ دار اور مزدور طبقے کی تقسیم کرتی ہے۔ جسے کارل مارکس اور اینگلز کمیونسٹ پارٹی کے شہرہ آفاق منشور میں تاریخی طور پر دو طبقات کی تاریخ سے معمون کرتے ہیں۔:

"تمام سماجوں کی آج کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ آزادی اور غلام پتریشین اور پلے بین، جاگیر دار آقا اور زرعی غلام گلڈ ماسٹر اور کاریگر غرضیکہ جابر اور مجبور تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ کبھی پس پردہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے۔"(۹)

تنویر سپرا اپنی محنت کا طبقاتی شعور رکھتا ہے۔ اسے علم ہے کہ بنیادی عامل دولت مزدوروں اور محنت کشوں کی محنت ہے۔ اس لیے سپرا کے ہاں سرمایہ داری نظام کے بنیادی تضاد یعنی محنت کش طبقے کی پیدا کی ہوئی دولت پر قبضے کے خلاف شدید شعوری رد عمل ملتا ہے۔

میں جاہل میں غیر مہذب میں کافر میں چور
میری محنت کا پھل کھانے والے جنٹلمین(۱۰)

"میری محنت" تنویر سپرا کے طبقاتی شعور کی بہترین دلیل ہے۔ انہیں اپنی محنت کا احساس ہے اور محنت کا استحصال کرنے والے طبقے کی پہچان بھی ہے۔ وہ مزدور کی محنت سے پیدا ہونے والے قدر زائد کا مضبوط طبقاتی شعور رکھتے ہیں۔ ذیل میں قدر زائد پر ان کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔ قدر زائد پر اس قدر جمالیاتی شعری اظہار کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔

آج بھی سپرا اس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے
میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں(۱۱)

تنویر سپرا اپنی محنت کے احساس سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ اپنی اس تخلیقی صلاحیت یعنی محنت کے جوہر سے سرشار بھی دکھائی دیتے ہیں ایک طبقاتی شعور رکھنے والے شاعر کا اپنی محنت کے عمل سے منسلک ہونا ازبست ضروری ہے۔ تبھی وہ استحصال اور جبر کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہے۔

تنویر ایک لذت تخلیق کے سوا
جو کچھ بھی تھا جہاں میں سراسر فضول تھا(۱۲)

محنت کے استحصال کا شعور تنویر سپرا کے ہاں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی محنت سے پیدا ہونے والی دولت کو بطور مزدور طبقہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ وہاں وہ اس محنت سے پیدا شدہ دولت کو حاصل کرنے کے لیے اپنا حق بھی طلب کرتے ہیں

کار یگروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کاغذی اسناد کھا گئی(۱۳)

مزدور ہوں محنت کا صلہ مانگ رہا ہوں
حق دیجیے خیرات نہیں چاہیے مجھ کو(۱۴)

مگر سپرا کو معلوم ہے کہ سرمایہ دار حیلہ گر ہے وہ سرمائے پر اپنے غیر انسانی حق سے دستبردار نہیں ہو گا۔ اس لیے وہ مزدور طبقے کو آگے بڑھ کر انقلاب کے ذریعے اس سرمایہ داری نظام کو ختم کرنے کا عندیہ دیتے ہیں۔ ان کے شعروں میں استعمال ہونے والے لفظ جیسے ہتھوڑا، درانتی، سرخ پھریرے، سویرہ کھیت کھلیان، گندم بو میں، مشینیں خالصتاً اشتراکی الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کی ڈکشن سے ان کے طبقاتی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ سرمایہ داری نظام کے مقابلے میں مزدوروں کے نمائندہ اشتراکی سماج کے قیام کے خواہاں ہیں۔ ایک ایسا اشتراکی سماج جس میں

مزدوروں کو ان کی محنت کا صلہ مل سکے اور کوئی بھی ان پر استحصال نہ کر سکے۔ اس لیے وہ مزدوروں کو دعوت دیتے ہیں۔

گرم ہے لوہا ہتھوڑا تھام کس کے وار کر
آج کی محنت کا حاصل دائمی آنند ہے(۱۵)

کارل مارکس نے کہا تھا دنیا بھر کے مزدورو ایک ہو جاؤ تمہارے پاس کھونے کے لئے صرف زنجیریں اور پانے کے لیے ساری دنیا سپرا بھی اس انقلابی شعور کے ذریعے سرمایہ داروں کے مقابلے کے لئے دعوت دیتے ہیں وہ اپنے طبقاتی شعور کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اب محنت کشوں کو ہاتھوں سے کشکول اٹھا کر پھینک دیتے چاہیں اور رزق پر قابض اجارہ دار نظام کو بازوؤں کے زور سے ختم کر دینا چاہیے۔

لگتا ہے اب یہ ہاتھ سے کشکول پھینک کر
چھینیں گے تم سے روٹیاں باہوں کہ زور سے(۱۶)

سرمایہ داری نظام سے نفرت تنویر سپرا کی شاعری میں ان کے طبقاتی شعور کا بنیادی وصف ہے۔ وہ محنت کی عظمت پر نازاں ہیں تو وہیں سرمایہ داری نظام سے نفرت اور اپنے مزدور ہونے پر فخر بھی کرتے ہیں:

اپنی تاریخ نسب پر اس لیے نازاں ہوں میں
عظمت محنت مرے اجداد کا منشور تھا
دشمنی زردار سے مجھ کو وراثت میں ملی
میں بھی مزدور میرا باپ بھی مزدور تھا(۱۷)

مزدور طبقے سے اپنی محنت اور اس طبقے کی ترجمانی پر ان کے ہاں ایک سرشاری کا عالم ملتا ہے وہ اس بات کا اظہار بھی اسی حسرت کے ساتھ کرتے ہیں۔

میری پہلی پہچان ہے دنیائے ادب میں
مزدور ہوں مزدور کا مندوب ہوا ہوں(۱۸)

مزدور طبقے کے مسائل ان کی زندگی کی ترجمانی ذاتی دکھ سے ہو کر سماجی دکھ کی طرف جاتی ہے۔ وہ خود بھی مزدور ہیں ایک مزدور کی زندگیوں کے مسائل سے واقف بھی ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں زندگی کا ایک گہرا مشاہدہ پایا جاتا ہے۔ اس گہرے مشاہدے سے ان کا طبقاتی شعور جنم لیتا ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

"تنویر سپرا کی شاعری اس لیے زندگی کے "پینوراما" زندگی کی بو قلمونی اور گونا گونی کا احاطہ کرنے کے درپے ہے۔ خود اسے اس بات کا دکھ ہے کے فن اور اس کے پیشے کے درمیان کتنا بعد ہے کہ باہر کی دینا کے لئے وہ صرف ایک شاعر ہے مگر دراصل پیشے کے لحاظ سے وہ ایک مزدور ہے ایک مزدور کو صرف اس کی کم آمدنی کے وجہ سے ہمارے معاشرتی ڈھانچے اور ہمارے معاشرتی نظام میں جو حیثیت حاصل ہے وہ کسی بھی پہلو سے منصفانہ اور باوقار نہیں ہے اور تنویر سپرا کو اس پر دکھ کرنے کا پورا حق ہے مگر اس کی شاعری نے اس کے فن اور اس کے پیشے کے مابین تفاوت ختم کر دیا ہے اور اس نے شاعر اور مزدور کو یوں باہم آمیخت کیا ہے کہ کم سے کم میں تو یہ سوچتا ہو کہ اگر تنویر سپرا مزدور ہونے کے ناطے اتنے بے شمار تجربات محسوسات اور مشاہدات سے لدا پھندا نہ ہوتا۔ وہ اس طرح کے سچے شعر کہ سکتا"۔(۱۹)

تنویر سپرا نے ایک مزدور ادیب ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے یہی وہ ایک فرق ہے۔ جو ایک مزدور اور غیر مزدور شاعر کے درمیان حد فاصل کھینچتا ہے۔ سپرا نے خود ساری زندگی محنت اور مشقت کی اس لئے اس کے ہاں محنت کش طبقے کا درد بھی زیادہ ہے اس کی شاعری طبقاتی شعور سے مزین ہو کر اور بھی جاندار ہو جاتی ہے۔ سرمایہ داری نظام کے استحصال کے خلاف سپرا کے ہاں غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ وہ اس نظام کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کے خلاف اپنی شاعری کے توسط سے سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں اور ان کے طبقاتی شعور سے مزدور طبقے کے لئے زندگی کی مزاحمت جنم لیتی ہے۔

محنت کشوں کے سرخ پھریروں کو دیکھ کر
شہزاد گان شہر سب ہی زرد رنگ تھے
مزدور اور کسان کو ہم دوش دیکھ کر
ششدر تھے سیٹھ اور زمیندار دنگ تھے(۲۰)

شہزاد اگان، سیٹھ، بیوپاری، مل مالک، آجر زردار جاگیر دار سپرا کے شعروں میں قابض اور بالادست طبقے کے علاماتی کردار ہیں وہ طبقہ جو محنت کشوں کی دولت کو ہڑپ کرتا ہے اور طبقاتی تفریق کے بیج سے سارے سماج کو تقسیم کر کے اجارہ داری قائم کرتا ہے یہ طبقہ ہر لحاظ سے مزدوروں اور محنت کشوں سے کٹا ہوا ہوتا ہے وہ آجر اور اجیر کو دھرتی کی دو مخالف قوتوں سے موسوم کرتے ہیں۔

مل سکتی ہیں ہم دونوں کی سوچیں یہ مت سوچ
میں اور میرا آجر ہیں اس دھرتی کے قطبین(۲۱)

مِل مالک اور مزدور دو الگ الگ سماجوں کے نمائندے ہیں مل مالک سماج کی اشرافیہ ہے۔ جن کی زندگی عیاشیوں اور تعیشات میں گزرتی ہے۔ جب کہ مزدوروں کی زندگی میں صرف فاقے ہوتے ہیں۔

مل مالک کے کتے بھی چربیلے ہیں
لیکن مزدوروں کے چہرے پیلے ہیں(۲۲)

جدید سرمایہ داری نظام کے استحصال کو تنویر سپرا نے بیان کیا ہے۔"اوور ٹائم "میں "شفٹ" کے ذریعے مزدور طبقہ سرمایہ داروں کی دولت میں بے پناہ اضافہ کرتا ہے مگر ان کی قسمت میں بھوک اور افلاس ہی ہوتا ہے یہ غیر فطری نظام مزدور طبقے کو مشینی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طبقاتی استحصال سے مزدوروں کی اخلاقیات اور تعصبات پر بھی اثرات پڑتے ہیں۔

"اوور ٹائم "کرکے میں نے سیٹھ کی جھولی بھر دی
پر بچوں کی فرمائش کو آئندہ پر ٹالا ہے
رات کو شفٹ چلا کر مجھ کو خوابوں سے محروم کیا
میرے آجر نے میری فطرت پر ڈاکا ڈالا ہے(۲۳)

"منڈی" جدید مارکیٹ اکانومی کی اصطلاح ہے منڈی کی معیشت میں اشیا کی پیداوار انسانی ضرورت کے بجائے منافع کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور نیوں لبرل اکانومی کے اس اصول کے تحت آزاد منڈی کا تصور نکلتا ہے۔ جہاں کنٹرول ریاست کے بجائے سرمایہ داروں اور نجی کمپنیوں کے پاس چلا جاتا ہے اس لئے سرمایہ داری نظام میں اشیائے خورد نوش سمیت ہر چیز میں مصنوعی قلت پیدا کی جاتی ہے۔ جس سے اشیا کی قیمتوں میں مانگ کی وجہ سے بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ سپرا اس صورت حال کا طبقاتی شعور رکھتے ہیں اور یوں بیان کرتے ہیں۔

کچھ تو میں گم ہوں کچھ یہ سوچ کہ بھی گم رہتا ہوں
منڈی میں جو مال نہیں ہے نرخ اسی کا بالا ہے(۲۴)

اس نظام زر کے بطن سے صرف مسائل ہی جنم لیتے ہیں انسانیت کی فلاح اور بہبود کے لئے اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا نظام سرمایہ داریت انسانی سماج میں جھوٹ، ریاکاری، خود غرضی، منافقت اور قتل و غارت کا سلسلہ لاتا ہے۔

ڈاکے فریب جھوٹ ریا قتل کے سوا
سپرا نظام زرنے زمانے کو کیا دیا(۲۵)

تنویر سپرا نے ابتدا ہی سے آمریت کے خلاف جدوجہد کی۔ وہ آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کے علمبردار تھے۔ انھوں نے عملی سیات میں حصہ لیا اور مزدور تحریک سے باقاعدہ طور پر وابستہ ہوئے۔ آمریت کے ظلم برداشت کیے مقدمات کا سامنا کیا۔ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لئے تحریک چلی تو تنویر سپرا اس تحریک کی اولین صفوں میں تھے بقول یوسف حسن:

"تنویر سپرا نے جہاں ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۹ء کے بعد ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۸ء کی بنیاد پرست فوجی آمریت کے بھی گیارہ سال تک تاریک ترین دور میں عوام دوست اور جمہوریت پسند قوتوں کا کھل کر ساتھ دیا اور اس کی پاداش میں مقدمہ بھی بھگتتا رہا وہاں اس نے اپنی پارٹی کے جمہوری دور میں بھی اپنے آئیڈیولاجیکل فریضوں کی عملی ادائیگی سے غفلت نہیں برتی۔"(۲۶)

آمریت کے خلاف عملی جدوجہد سے جو طبقاتی شعور ان کو ملا اس کی جھلک ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔

ہر در پہ اس نے وردیوں والے بٹھادیے
ہم نے گھر بنائے تھے زندان بن گئے(۲۷)

بعض جگہوں پر سپرا کربلا حسین منصور، ابوزر، کے ناموں کو کنایتہً استعمال کر کے آمریت اور استحصال کرنے والے طبقوں کے تضادات کو بھی سامنے لائے ہیں۔

جب حقیقت کو مسخ کر ڈالا
ایک آمر کی آمریت نے
جب سحر کا سہاگ لوٹ لیا
شیطانیت کی مہیب ظلمت نے

جب خلافت کو بادشاہی میں
ایک فرعون نے بدل ڈالا
جب محبت کو شر کے سانچے میں
ایک نمرود وقت نے ڈھالا(۲۸)

وہ استعاروں کے استعمال سے آمریت اور اس کے جبر کے خلاف رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے اس کو رد کرتے ہیں۔ وہ آمریت کے مقابلے میں مساوات اور جمہوریت کے طرف دار ہیں اور جمہور کے نعمے گاتے دکھائی دیتے ہیں اور خود کو شاعر عوام کہلانا پسند کرتے ہیں۔

مجھ سے نہ ہو سکے گی کسی شاہ کی ثنا
میرے قصیدے وقف ہیں جمہور کے لیے(۲۹)

میں شاعر عوام ہوں تعظیم کر نہ کر
ہر عہد میرا عہد ہے تسلیم کر نہ کر(۳۰)

تنویر سپرا نے اپنی شاعری میں سرمایہ داری اور جاگیر داری نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کیے رکھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے طبقاتی سماج کی بدصورتی کا اظہار بہت تلخ اور طنزیہ لہجے میں کیا۔ اس کے لہجے میں ایک کھردرا پن تھا۔ مزدوروں کسانوں اور محنت کش طبقے کے سماجی مسائل کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اسی لیے وہ اپنے خارجی ماحول سے بہت زیادہ جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے سپرا شاعری کے لیے مراقبے یا مصنوعی کیفیت کے طاری ہونے کا انتظار نہیں کرتا بلکہ وہ شور آلود اور چلاتی ہوئی مشینوں کی آواز سن کر ان سے شعر کشید کر لیتا ہے۔ وہ اس شور اور اعصاب کو شل کرتی ہوئی مشینی زندگی پر بھرپور شعر کہتا ہے۔

سوتا ہوں اب تو انگلیاں کانوں میں ٹھونس کر
بوموں کی اتنی قوت گویائی بڑھ گئی(۳۱)

تنویر اب تو حلق سے بھونپو کا کام لے
بہرے ہوئے ہیں کان مشینوں کے شور سے(۳۲)

بدترین استحصالی محنت کے نتیجے میں انسانی اعصاب کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور مشینوں کے شور سے مزدوروں کے اعصاب پر نفسیاتی اثرات پڑنے کا ذاتی تجربہ سپرا کے ہاں شعر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بدترین

اور غیر انسانی مشقت انسان کے جسم کے ساتھ اس کے روح کو بھی تھکا کے رکھ دیتی ہے۔ سرمایہ دار اس کی محنت کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کا عرق بھی نچوڑ لیتا ہے۔

اب تک مرے اعصاب پر محنت ہے مسلط
اب تک مرے کانوں میں مشینوں کی صدا ہے
اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے(۳۳)

تنویر سپرا اپنے سماج کا گہرا مشاہدہ کرتا ہے وہ سماج میں پائے جانے والے مسائل کا تجربہ کرتا ہے تو اس کا طبقاتی شعور اسے بتاتا ہے کہ ان تمام مسائل کی وجہ سماج پر قابض ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری ہے۔ وہ ملوں کھیتوں اور فیکڑیوں میں مل مالکوں، زرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدوروں اور محنت کشوں کے استحصال کو دیکھتا ہے تو وہ اس بات پر شدید غم و غصے کا اظہار کرتا ہے اس غم وہ غصے میں اس کا طبقاتی اور سماجی شعور اسے اس طبقاتی اور استحصالی نظام سے بغاوت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لئے وہ جس جمہوری انداز میں پہلے اپنا حق طلب کرتا ہے بعد میں وہ جمہوری انداز ایک طبقاتی تصادم کا عندیہ دیتا ہے

کل تک ممکن ہے میں بھی بھر پور بغاوت کر بیٹھوں
آج اگر شکوے باطرز جمہوری کرتا ہوں(۳۴)

گنبد کی طرح گونج اٹھے ساری خدائی
خواہش ہے مری آج میں اس زور سے چیخوں(۳۵)

سپرا کا طبقاتی شعور صرف اس نظام زر کا خاتمہ ہی نہیں چاہتا بلکہ وہ مزدوروں اور محنت کشوں کے سرخ انقلاب کا داعی بن کر اس نظام زر کے بدلے ایک حقیقی غیر طبقاتی سماج کا خواب بھی دیکھتا ہے۔ بقول یوسف حسن:

"جدید اردو شاعری میں اقبال اور ترقی پسندوں نے کہیں اپنے اپنے اور کہیں مشترکہ فکری حوالوں سے ایک غیر استحصالی غیر طبقاتی سماج کے خواب کو روشن کیا۔ تنویر سپرا بھی اس خواب کا امین ہے۔ وہ اپنے مثالی سماج کی تعمیر کے لیے تو منفی قوتوں کے خلاف جارحانہ رزم آرائی کا زاویہ رکھتا ہے۔"(۳۶)

سپرا کے ہاں غیر طبقاتی سماج کے قیام کے خواب کی تعبیر ایک سرخ انقلاب سے موسوم ہے جس کا اظہار وہ اپنے طبقاتی شعور کے ذریعے مندرجہ ذیل اشعار میں کرتا ہے:

بپھرے ہوئے ہجوم کو ان کی تلاش تھی
جن کے وجود باعث افلاس ننگ تھے
محنت کشوں کے سرخ پھریروں کو دیکھ کر
شہزاد گان شہر سبھی زرد رنگ تھے
مزدور اور کسان کو ہمدوش دیکھ کر
ششدر تھے سیٹھ اور زمیندار دنگ تھے(۳۷)

سرخ پھریرے کا لفظ دراصل علامتی طور پر محنت کشوں کے سرخ پرچم کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ایسی سماجی تبدیلی کے خواہاں نظر آتے ہیں جو طبقاتی تفریق کا خاتمہ کرے گی۔ جہاں بلند و بالا تخت گر جائیں گے اور سرخ پرچم کے سائے تلے کسان اور محنت کش اس جنگ کو جیت لیں گے۔

اونچے اونچے کاخ گریں گے دھول اڑے گی لانوں میں
اب کے ایسی جنگ چھڑے گی جھگیوں اور ایوانوں میں
اے جاگیروں کے مختارو اب وہ لمحے دور نہیں
سرخ پھریرے لہرائیں گے جب کھیتوں کھلیانوں میں(۳۸)

مجموعی طور پر تنویر سپرا کے سماجی اور طبقاتی شعور کا تجزیہ اور مطالعہ کرنے سے معلوم پڑتا ہے۔ وہ اپنے سماج کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور سماج میں پائے جانے والے تضادات کا طبقاتی شعور بھی رکھتے تھے۔ اس لئے وہ سماجی مسائل کا ادراک اس کے پس پشت محرکات کا بھی گہرا علم رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا سماجی اور طبقاتی شعور ان کے سماج کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ یہی ایک حقیقی ادیب کے طبقاتی اور سماجی شعور کا تقاضا ہے بقول اختر حسین رائے پوری۔

"ادب کا یہ مقصد ہے زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گر دوپیش کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔۔۔ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے"۔(۳۹)

اقبال ساجد کے ہاں طبقاتی و سماجی شعور:

سماج وہ بنیادی ادارہ ہے جو کسی بھی انسان کے شعور پر براہ راست اثر ڈالتا ہے۔ انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ اس ماحول میں پائے جانے والے تہذیبی سیاسی معاشی اور سماجی افکاراور مباحث اس کے کردار اور

افکار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے سماج کا مطالعہ اور تجزیہ ضروری ہے۔ ایک عام انسان کی نسبت ایک ادیب کے مشاہدے اور سماجی مطالعے کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے۔ وہ زندگی اور سماج کے تعلق کو گہرائی سے سمجھتا ہے اور زندگی کے اس تغیر اور تبدل کو جذب کرتا ہے۔ زندگی کے مسائل کا ادراک کر کے ان کا حل چاہتا ہے۔ اسی سے اس کا سماجی شعور تشکیل پاتا ہے۔ اور سماجی سطح پر وہ جب ان مسائل کی وجہ اور ان کے پس پشت محرکات اور معاشرتی تضاد سے آگاہی اس کے طبقاتی شعور پر دال ہوتی ہے۔

اقبال ساجد کا طبقاتی اور سماجی شعور انسانی سماج کے مسائل طبقاتی معاشرت اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال سے عبارت ہے۔ محروم طبقات کی زندگی کی تلخیوں اور معاشرے میں پائے جانے والے ان گنت مسائل کے انبار سے وہ اپنے سماجی شعور کا خمیر اٹھاتے ہیں۔ اسی سماجی شعور کے توسط سے وہ معاشرے میں بھوک، غربت، مہنگائی، ننگ، وافلاس، تقسیم، جہالت، بے روزگاری، ظلم، استحصال، جبر کے خلاف رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے طبقاتی اور سماجی شعور کے حوالے سے جواز جعفری لکھتے ہیں۔

> "ساجد یہ جنگ ایک ایسی زر پرست سوسائٹی میں تنہا لڑ رہا تھا جہاں تخلیق اور تخلیق کار کو تیسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے جہاں چیزوں حتی کہ رشتوں کو بھی روپے کے معیار سے ناپا جاتا ہے لہٰذا جس کے پاس جتنا سرمایہ ہے۔ اس کے پاس اتنا بڑا سچ ہے البتہ اس ماحول میں اگر کوئی شخص جھوٹا ہے تو وہ فن کار ہے"۔(۴۰)

اقبال ساجد کا سماجی شعور طبقاتی کی نظام کے خلاف شدید غم وغصے اور ناراضی پر مبنی ہے۔ وہ استحصالی نظام اور اس کے پروردہ لوگوں کی حقیقت کو اپنے شعروں کے ذریعے آشکارا کرتے ہیں۔ اس طبقاتی نظام معاشرت کے خلاف احتجاج ان کے سماجی شعور کا خاصہ ہے جس میں بغیر محنت کیے ایک طبقہ سماج کی دولت پر قابض ہوتا ہے۔

وہ اس ظلم کے خلاف سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں۔ وہ نظام زر سے بہت شاکی دکھائی دیتے ہیں جو دولت کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک گر سکتا ہے اور انسانی اخلاقیات کو پامال کرتا ہے۔

دنیا نے زر کے واسطے کیا کچھ نہیں کیا
اور ہم نے شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا
غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
اور ہم نے شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا(۴۱)

سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں اور استحصال کا ذکر ان کے ہاں بار بار ملتا ہے۔ مزدور اور محنت کش محنت تو کرتا ہے مگر اپنی محنت سے حاصل ہونے والی پیداوار کے منافع سے محروم ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ دار معاشرے کا بنیادی تضاد ہوتا ہے۔ مزدور اپنی محنت سرمایہ دار کو فروخت کرتا ہے۔ سرمایہ دار اس محنت کو استعمال میں لا کر پیدا ہونے والے منافع کو ہڑپ لیتا ہے۔

"جس کی دہری فطرت سرمایہ دارانہ معاشرے کے مرکزی تضاد کو ظاہر کرتی ہے۔ مزدور اپنے خیال میں اپنی محنت مالک کے ہاتھ بیچتا ہے۔ لیکن در حقیقت وہ اپنی محنت بیچتا ہے جسے سرمایہ دار اپنی مرضی سے استعمال کرتا ہے۔ اس طرح حاصل ہونے والی قدر زائد وہ اجرت ہے جو مزدور طبقے کو ادا نہیں کی جاتی یہی سرمایہ کے جمع ہونے کا ذریعہ ہے۔ یہی نہ ادا کی جانے والی اجرت کرایہ، سود منافع اور ٹیکس کی شکل میں معاشرے کے ان افراد کی کفالت کرتی ہے جو محنت نہیں کرتے طبقاتی کشمکش دراصل اسی قدر زائد کی تقسیم کی کشمکش ہے"۔(۴۲)

اقبال ساجد اسی نظام زر کے خلاف سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں جس میں سرمایہ دار طبقہ مزدوروں اور محنت کشوں کی محنت کا استحصال کرتا ہے۔ ان کے ہاں اس ظلم اور استحصال کے خلاف رد عمل دکھائی دیتا ہے۔

ستم تو یہ وہ فرہاد وقت ہے جس نے
نہ جوئے شیر نکالی نہ بت تراش ہوا(۴۳)

یہ سرمایہ دار طبقہ یوں بغیر کسی محنت کے ہی اس دولت پر قابض ہو جاتا ہے اور فرہاد بن کر "جوئے شیر" کا حق جتاتا ہے جس میں اس کی کوئی محنت یا مشقت شامل نہیں ہوتی اسی طرح وہ سرمایہ داروں کو عوام کی دولت پر عیاشی کرتا ہو دیکھتے ہیں تو وہ پکار اٹھتے ہیں۔

ٹھہرے ہیں زر و سیم کے حقدار تماشائی
اور مارسیہ ہم نے دفینے سے نکالا(۴۴)

کھیتوں میں جیسے ان کی آنکھیں ٹنگی ہوئی ہیں
اندھے درانتیوں سے بینائی کاٹتے ہیں
بے گھر ہوں ہم بلا سے لیکن حصول زر میں
دیوار توڑتے ہیں انگنائی کاٹتے ہیں(۴۵)

طبقاتی سماج میں انسانوں کا کمزور ہونا بھی ان کا گناہ بن جاتا ہے۔ یہ طبقاتی سماج انسانوں کو دولت سے محروم کرتا ہے۔ معاشی طور پر کمزور کرتا ہے۔ اسی معاشی محرومی کا احساس غریبوں کے لیے جرم اور گناہ بن جاتا ہے۔

طاقت اور کمزوری میں فرق یہی تو ہوتا ہے
ظلم بھی کرنا ایک ثواب اور سہنا بھی ایک گناہ

سونا پاس نہیں ہے جن کے وہ مجرم کہلاتے ہیں
کانسی سے جو بنا ہوا ہے وہ گہنا بھی ایک گناہ(۴۶)

طاقت اور کمزوری کے یہ معیارات سرمایہ داری نظام طے کرتا ہے۔ اس سرمایہ داری نظام کی جڑیں قیام پاکستان کے ساتھ ہی مضبوط ہونا شروع ہوئی ہیں۔ اقبال ساجد تقسیم کے بعد ایک نئے سماج کے قیام کا خواب دیکھ رہا تھا مگر اس نئے سماج کے بجائے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اجارہ داری دیکھ کر اسے سخت مایوس ہوئی۔ اس لیے وہ اس سٹیٹس کو یعنی طبقاتی تفریق کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ تقسیم کے بعد کے نامساعد حالات نے بھی اقبال ساجد کے سماجی اور طبقاتی شعور کو جلا بخشی۔ اس صورت حال کے حوالے سے ڈاکٹر جواز جعفری لکھتے ہیں۔

"ایک سازش کے ذریعے تقسیم کے وقت ملک میں مساواتی بنیادوں پر سوسائٹی کی تشکیل کے بجائے نئے ملک میں وہی پرانی طبقاتی تقسیم روا رکھی گئی مخصوص طبقے کا کنٹرول، کلچرل شناخت میں ناکامی۔۔۔ چناچہ ایسی سوسائٹی جس کی بنیاد توہین پر رکھی گئی ہو۔۔۔ جہاں ایک طبقہ دوسرے کا استحصال کرے جہاں دوسروں کا گلہ دبانے اور کہنی مار کر آگے نکلنے والوں کو کامیاب انسان گردانا جاتا ہو۔ اس نے سٹیس کو کے خلاف آواز بلند کی جس کے نتیجے میں ہماری نسلیں ڈپریشن اور فرسٹریشن کا شکار ہوئیں۔ اقبال ساجد ایسے لوگوں سے ابھر کر سامنے آیا تھا لہٰذا وہ اس پورے سسٹم کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا جو آرزوؤں سے بھرے ہوئے دلوں کو بے رحمی سے کچل ڈالتا ہے"۔(۴۷)

تقسیم کے بعد وہ نئے سماج کے قیام کے حوالے سے سوال کرتا ہے۔ اسے امید تھی کہ نیا سماج اس طبقاتی تفریق سے پاک ہو گا۔ اس لے وہ سوال کرتا ہے

سنا احوال تیرے شہر کے معیار کیسے ہیں
مکین کیسے ہیں اس کے درودیوار کیسے ہیں
وہاں مزدور کی اجرت ادھوری ہے کہ پوری ہے ؟
مزاجاً اور ذہناً کا رخانہ دار کیسے ہیں؟(۴۸)

سرمایہ داری نظام کی ایک خاص پہچان ہے اس نظام زر میں ہر شے جنس ہوتی ہے۔ انسانی محنت کے استحصال کی وجہ سے سرمایہ داری نظام اخلاقیات میں انسانی رشتے، محبت، نفرت، عزت، شہرت، لمس، حسن سمیت ہر شے برائے فروخت ہوتی ہے۔ جس طرح مارکیٹ میں ہر شے بکنے کی غرض سے آتی ہے بالکل اسی طرح انسان اور اس سے جڑی ہر چیز کی بھی قیمت لگائی جاتی ہے۔ کارل مارکس اسے سرمایہ داری نظام کا شاخسانہ قرار دیتا ہے۔ سبط حسن اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں۔

"سرمایہ داری نظام میں اشیا کا جبر انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مارکس تمام عمر اسی جبر کے خلاف لڑتا رہا تا کہ فرد آزاد ہو اور اس کو اپنی فطری صلاحتیوں کے جوہر دکھانے کا موقع ملے۔۔۔ مارکس نے اس تخلیقی قوت کا سراغ ہی نہیں لگایا جس جبر کی جڑوں میں طاقت آتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ تخلیقی قوت منتقل کس طرح ہوتی ہے۔ تخلیقی عمل میں انسان کی ذہنی اور جسمانی اعضاء میں کس طرح تحلیل ہوتی ہے اور پھر کسی طرح سرمائے کی شکل اختیار ہوتی ہے یعنی سرمایہ دار طبقہ اقتصادی اور سیاسی اقتدار کا راز کیا ہے۔"(۴۹)

اشیا کے اس جبر کو اقبال ساجد کے ہاں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں انسان کی حیثیت ایک کرائے پر ملنے والی شے کی طرح ہو جاتی ہے وہ ایک ایسے سماج سے کافی شاکی دکھائی دیتے ہیں

حاصل کرو مرے لیے نفرت کرائے پر
لے آؤ سارے شہر کی خلقت کرائے پر
صاحب اگر ہیں آپ تو سب آپ کے غلام
ہر شے ملے گی حسب ضرورت کرائے پر(۵۰)

یہاں "ہر شے" سے اقبال ساجد کی مراد وہ سب کچھ ہے جسے سرمایہ داری نظام نے برائے فروخت کے لیبل کے ساتھ بازار میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس برائے فروخت میں ایک صاحب زر انسان کو اس کی "حسب ضرورت" سب

کچھ مل جاتا ہے۔ بس اس کے پاس خریدنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ جدید کمرشل سرمایہ داری نظام مقدس انسانی رشتوں سمیت ہر شے کو برائے فروحت کر رہا ہے۔ ہر شے کی ایک قیمت لگی ہوئی ہے، انسانی رشتے عزت، محبت، شہرت سمیت ہر شے کے بازار میں لا کر نرخ مقرر کیے گئے ہیں۔ اس لیے اقبال اسی غزل میں آگے کہتا ہے۔

جسموں کی منڈیوں میں سبھی کچھ ملے گا دوست
تنہائی، قرب، لمس و حرارت کرائے پر
جائز ہے کاروبار کی خاطر جہاں پہ سب
چندہ کفن کے واسطے میت کرائے پر
پیسہ ہے تیرے پاس تو کچھ نام بھی کما
لے آکسی غریب سے شہرت کرائے پر(۵۱)

یہ اس سرمایہ داری نظام کی منڈی کی حقیقت ہے جس کو اقبال ساجد اپنے شاعری کی ذریعے بیان کرتے ہیں۔ جہاں اگر اہل زر کو سب کچھ کرائے پر دستیاب ہے تو وہاں غریب مزدور اور محنت کش طبقے کو اپنا سب کچھ بیچ کر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ خریدار پیدا کرنا اور مارکیٹ میں اشیا سمیت سب کچھ بیچنا اس سرمایہ داری نظام کی منڈی کا بنیادی اصول ہے۔ وہ اس خرید و فروخت پر یوں طنز کرتے ہیں۔

کھول لے بازار میں چہرے سجانے کی دکان
وقت ہے پیسہ کمالے رنگ روغن بیچ کر
تو نے جو لکھا ہے اس کو کوڑا کرکٹ ہی سمجھ
پیٹ کا دوزخ بجھا سوچوں کا ایندھن بیچ کر(۵۲)

ایک شاعر کا طبقاتی شعور اس کے سماج میں پائے جانے والے مسائل کی وجہ اور سماجی تضادات کی نشان دہی میں مدد دیتا ہے۔ اقبال ساجد کے ہاں بھی جہاں سماجی شعور کے ذریعے سماجی کے مسائل کا احاطہ نظر آتا ہے تو وہیں ان کے ہاں ان مسائل کے طبقاتی وجوہات بھی نظر آتی ہیں۔ وہ ان تمام مسائل کے خلاف غم و غصہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو کہ طبقاتی معاشرت کی پیداوار ہیں۔ اس سے اقبال ساجد کے ہاں غربت ننگ افلاس بھوک ظلم استحصال کا ذکر بار بار ملتا ہے۔

غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا

غربت کی تیز پہ آنچ اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا؟(۵۳)

انسان کو اپنی بنیادی ضروریات زندگی تک پوری کرنے کے لئے غیر انسانی مشقت کرنی پڑتی ہے اس کے باوجود وہ محرومیوں کا شکار رہتا ہے اور زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے سب کچھ گروی رکھنا پڑتا ہے۔اس صورت حال کا نقشہ اقبال ساجد نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ جس سے ایک عام انسان کی زندگی کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچا چلا آتا ہے۔

مکاں گروی، درو دیوار گروی
ہماری خواہشیں ،معیار گروی
ہمارے سر رکھے ہیں رہن اس نے
ہمارے نام کی دستار گروی
چمن سارے کا سارا لٹ گیا ہے
ہوا خوشبو گل و اشجار گروی(۵۴)

نیولبرل اکانومی سے پیدا ہونے والے اس اہم مسئلے کی بھرپور نشاندہی کی گئی ہے جہاں انسان کو اولین تو بنیادی ضروریات سے محروم کیا جاتا ہے اور بعد میں قرض دے کہ انسانوں سے سب کچھ گروی رکھ کر ان کا سب کچھ ہڑپ لیا جاتا ہے۔یوں ایک انسان اپنا سب کچھ اس نظام کے ہاتھوں لٹا کر خالی ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہے اور جب اس کے پاس قوت خرید ختم ہو جاتی ہے تو وہی بازار جو ایک خریدار کی حیثیت سے اس کی عزت کر رہا تھا اب اس کی قوت خرید سے محروم ہوتے ہی دھتکار دیتا ہے۔کیوں کہ بازار کا اصول ہے عزت صرف اس کی ہے جس کے پاس دھن دولت ہے۔

جیب میں کچھ بھی نہیں تھا پھر پگھلتی کس طرح
سرد مہری مجھ سے برتی گرمی بازار نے(۵۵)

اک طرف خوشیاں پڑیں تھیں اک طرف رکھے تھے کرب
کھل کے یہ منظر دکھائے شہر کے بازار نے(۵۶)

بازار کا یہ بھید بھاؤ دراصل منڈی کی معیشت سے انسانی سماجی رشتوں کی شکست وریخت کی علامت ہے۔ منڈی پر دولت یعنی سرمائے کی اجارہ داری قبضہ انسان اور اس سے جڑے سماجی رشتوں کی بے توقیری کا سبب بنتا ہے۔

انسانی رشتوں کا احترام اور تقدس دم توڑ دیتا ہے بازار بنیادی طور اقبال ساجد کی شاعری میں منڈی کی معیشت کے استحصال کی علامت ہے۔ بازار میں انسان سے اس کی محنت چھین لی جاتی ہے۔ بازار یا منڈی میں انسانوں کے خوابوں کی تجارت کر کے اس سے اس کا سب کچھ ہتھیا لیا جاتا ہے۔ جدید لبرل معیشت کا نقشہ اپنے طبقاتی شعور کے ذریعے اقبال ساجد نے یوں کھینچا ہے۔

لٹ گئے بازار میں میرے بھی سب پتھر کے چاند
اس کے ہاتھوں سے بھی مٹی کے ستارے چھن گئے(۵۷)

منڈی کی اس معیشت اور مشینی عہد سے انسان کی جمالیاتی حس کو بھی شدید متاثر کیا ہے۔ مشینوں کی یلغار نے انسان سے احساس حساسیت جمال دوستی کی کیفیت کو چھین لیا ہے۔ تیز بھاگتی چنگھاڑتی مشینیں انسان کے اعصاب اور ذہن کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ اقبال ساجد اس لیے اس دور میں مشینوں کے ان اثرات کو اس انداز میں دیکھتے ہیں۔

مشینی دور میں کیا قصہ لب و رخسار
حکایت شب زلف دراز کچھ بھی نہیں(۵۸)

اقبال ساجد کا طبقاتی و سماجی شعور معاشرتی ناانصافی، ظلم، بربریتِ استحصال کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ وہ اس طبقاتی تفریق کے خلاف شدید غم و غصہ بھی کرتے ہیں۔ سماج میں ہونے والا جبر اور استحصال ان کی شاعری کا محرک ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے اس جبر و استحصال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے اقبال ساجد کی شاعری دراصل اس عصری شعور کا آئینہ ہے۔ جسے وہ اپنے اردگرد کے سماج میں اپنی حسیات کے ذریعے محسوس کرتے ہوئے شعری لباس میں ڈھالتے ہیں۔ وہ اس جبر پر مبنی نظام کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور ظلم پر مبنی اس سماج کو تباہ و برباد کرنے کی ٹھان لیتے ہیں

اس ظلم کی بستی سے تو آندھی کی طرح اٹھ
اس شہر کی گلیاں خس و خاشاک سے بھر جا
حسرت سے نہ ہاتھوں کی لکیروں کی طرف دیکھ
جا وقت کے ماتھے پہ شکن بن کے ابھر جا(۵۹)

ظلم کے خلاف ان کی شاعری میں بھرپور اور توانا آواز موجود ہے۔ طبقاتی اور سماجی شعور کے ذریعے ان کی شاعری میں جبر کے خلاف مزاحمت کا انداز ملتا ہے۔ اس لیے وہ ظلمت کے خلاف سینہ سپر ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

پیاسے ہیں پھول ، پیڑ انہیں روشنی پلا
ظلمت کی بھٹیوں سے شعاعیں کشید کر(۶۰)

طبقاتی تقسیم نے انسانی سماج کے ہر شعے کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طبقہ دولت پیدا کرتا ہے مگر دولت سے محروم ہو جاتا ہر دوسرا طبقہ بغیر محنت کے دولت پر قابض ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ ظالم ہے تو دوسرا طبقہ مظلوم ہے۔ ایک جابر ہے تو دوسرا طبقہ مجبور ہے۔ ایک آقا ہے تو دوسرا غلام۔ غرض یہ کہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے سارا معاشرہ طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ طاقت اور دولت سے معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ معاشرے کے معیارات بدل جاتے ہیں۔ دولت اور ثروت سے محروم لوگ کمزور کہلاتے ہیں۔ جبکہ جو قابض طبقہ ہوتا ہے۔ اس کو دولت کی وجہ سے طاقت اور اختیار مل جاتا ہے۔

طاقت اور کمزوری میں فرق یہی تو ہوتا ہے
ظلم کرنا بھی ایک ثواب اور سہنا بھی ایک گناہ
سونا پاس نہیں ہے جن کے وہ مجرم کہلاتے ہیں
کانسی سے جو بنا ہوا ہے وہ گہنا بھی ایک گناہ(۶۱)

جبر اور استحصال کے خلاف ان کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں

کاٹی نہیں تو اور بھی پھیلے گی شاخ جبر کی
صبر کی بات چھوڑیے ہوتی ہے حد بھی جبر کی
صبر کی بیل منڈھے چڑھ نہ سکی مرے خدا
دہر میں دھوم دھام سے رسم چلی ہے جبر کی(۶۲)

اس طبقاتی تفریق کے خلاف ان کے ہاں دکھ کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ اس ظلمت کو دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ غصہ کرتے ہیں اور بعض اوقات خود سے سماج سے اور خدا سے بھی شکوہ کرتے ہیں۔

اب کے برس بھی تازہ اجالوں کے ہاتھ سے
چسپاں فصیل وقت پہ ظلمت بہت ہوئی(۶۳)

معاشرتی ظلم کا ذکر ان کے ہاں بار بار ملتا ہے۔ وہ اس معاشرتی ناانصافی اور جبر کی صفائی میں ہونے والی ہر دلیل کو رد کرتے ہیں۔ یہ ایک منطقی رویہ بھی ہے۔ کیوں جبر اور استحصال پر مبنی نظام کے پاس کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں ہوتا۔ ایسا نظام جو انسانیت کے خون اور ہڈیوں کو نگل کر قائم ہو۔ وہ نظام انسانیت کے لیے زہر قاتل ہوتا ہے اقبال ساجد اسے لیے اس نظام کے حق میں اٹھنے پر شہادت اور صفائی کو رد کرتے ہیں۔

ظالم معاشرے کی صفائی میں کچھ نہ کہ
قاتل کے حق میں دے نہ شہادت کرائے پر(۶۴)

سرمایہ داری نظام کی بنیاد زر کی ہوس ہے زر پرستی کے لیے سرمایہ دار کسی بھی حد تک جا سکتا ہے اس لیے ایک سرمایہ دارانہ معاشرے میں انسان سے زیادہ سرمائے کی عزت ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مال دولت جمع کرنے کی ہوس انسان کو لالچی اور خود غرض بنا دیتی ہے۔ اس صورت حال کو اقبال ساجد کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

زن کی ہے ، زمیں کی ہے کہیں گھر کی ہوس ہے
اس شہر میں ہر شخص کو ہی زر کی ہوس ہے
سب شاہ گدا ایک مرض کے ہیں مقابل
دیوار کا لالچ ہے کہیں در کی ہوس ہے(۶۵)

اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ شعر ایک سرمایہ دارانہ سماج کی اخلاقیات اور نفسیات کی بہت ہی زبردست عکاسی کرتا ہے۔ سرمایہ داری نظام سماج میں مقابلہ سازی کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی نفسیات سے کھیلتا ہے۔ پہلے اشیا کو انسان کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے۔ پھر ان اشیا کو عزت احترام، شہرت کا معیار بنا کر پیش کرتا ہے۔ نیولبرل اکانومی سے پیدا ہونے والے کنزیومرازم اور صارفیت کے اسی نظریے کے تحت سارے معاشرے کو ایک اندھے مقابلے کی دوڑ میں لگا دیا جاتا ہے۔ لوگوں کی نفسیات بن جاتی ہے کہ جس کے پاس گاڑی بنگلہ کوٹھی ہو گی وہی قابل عزت اور قابل احترام ہو گا۔ نتیجتاً سارا معاشرہ اندھا دھند دولت کے حصول میں ہر جائز اور ناجائز ذرائع کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس، ہوس زر میں مبتلا معاشرہ تمام اخلاقیات اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر صرف دولت حاصل کرنے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کے باوجود جہاں سارا معاشرہ اس دولت کی اندھی دوڑ میں لگا ہوا ہے اور حصول زر کے لیے کیا کیا کچھ کر رہا ہے وہیں اقبال ساجد اپنی انانیت اور خودداری کو سرمایہ داریت کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیتے۔

دنیا نے زر کے واسطے کیا کچھ نہیں کیا
اور ہم نے شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا
مانگی نہیں کسی سے بھی ہمدردیوں کی بھیک
ساجد کبھی خلاف انا کچھ نہیں کیا(٦٦)

اقبال ساجد کا سماجی اور طبقاتی شعور عصری مسائل کو اپنی شاعری میں سمولیتا ہے۔ وہ زندگی کے چھوٹے اور بڑے تمام مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ وہ ہمارے قومی اور سماجی مسائل کو ایک بالغ نظر شاعر کی طرح دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر آبادی کے بڑھتے ہوئے مسئلے کی نشان دہی کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

بھر جائے گی زمین کی صورت فضا بھی کل
اٹھ جائے گی خلا کی بھی وسعت کرائے پر(٦٧)

بے روزگاری اہم سماجی مسئلہ ہے۔ اس بے روزگاری کی وجہ سے بڑھا لکھا نوجوان طبقہ بھی شدید متاثر ہوا ہے۔ اقبال ساجد اس اہم مسئلے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

اب پڑھے لکھے بھی ساجد آکے بیکاری سے تنگ
شب کو دیواروں پہ چسپاں پوسٹر کرنے لگے(٦٨)

ہمارا سماج ان گنت معاشرتی مسائل میں جکڑا ہوا ہے۔ جدید دور میں غربت اور مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ خون بیچنے کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا معاشرتی المیہ ہے۔ غربت اور بھوک ایسے کئی معاشرتی المیوں کو جنم دیتی ہے۔ اقبال ساجد "ہسپتالوں" کے اس کاروبار کا ذکر کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا(٦٩)

اقبال ساجد کی شاعری میں جہاں انسانی رشتوں کی توڑ پھوڑ اور شکست وریخت کا ذکر ہے وہیں ان کی شاعری میں ماں کا رشتہ اسی خود غرضی پر مبنی سماج میں محبت اور خلوص کی علامت ہے۔ ماں ایک رشتہ ہے جو "سانپوں" سے بھرے اس سماج میں تحفظ اور اپنائیت کی علامت ہے۔ اقبال ساجد کی شاعری میں سانپ ایک خود غرض اور لالچی سماج کی علامت ہے ایک ایسا سماج جو خود غرضی لالچ نفس پرستی مکاری اور عیاری سے بھرا ہوا ہے ڈاکٹر جواز جعفری اس حوالے سے رقم طراز ہیں۔

"سانپ ساجد کی ایک اور اہم علامت ہے جسے وہ بیک وقت استحصالی گروہ اور دوستوں کے بھیس میں چھپے ہوئے دشمنوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ استحصال طبقہ سانپ کی طرح کمزور لوگوں کے مفادات اور حقوق کو مسلسل ڈس رہا ہے اور ان کی خود غرضی فریب اور مکاری کا زہر آہستہ آہستہ معاشرے کے جسم میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ سانپ کہیں طاقت ور رشتوں کے روپ میں اور کہیں دوست نما دشمنوں کی صف میں ہمارے ارد گرد لپٹے ہوئے ہیں۔ ساجد کے نزدیک سانپوں کے زہر سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے؛ماں کی دعا؛"۔(۷۰)

سانپ کی فطرت رکھنے والا یہ سماج اور اس کے خود غرض لوگ اپنے مفادات کے لیے کسی کو بھی ڈس سکتے ہیں۔

خوف آیا نہیں سانپوں کے گھنے جنگل میں
مجھ کو محفوظ مری ماں کی دعانے رکھا(۷۱)

اسی طرح ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

جب ماں کی دعا ساتھ ہے سانپوں کے نگر میں
ساجد میں حواس اپنے کبھی گم نہیں کرتا(۷۲)

اقبال ساجد کی شاعری کا خمیر دراصل سماجی حقیقت نگاری سے اٹھتا ہے۔ وہ اپنے خارج میں ہونے والی تبدیلی کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی محرومی بے بسی تکالیف دکھ کو شاعری کی زبان عطا کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کے ذریعے وہ انسانی سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک ادیب کا طبقاتی شعور اس سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے ادب کی بنیادیں زندگی سے تلاش کر کے اٹھائے۔ اختر حسین رائے پوری نے اس لیے ترقی پسند ادیبوں سے تقاضا کیا تھا کہ۔

"وہ ثابت کر کے دکھائیں کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔"(۷۳)

اقبال ساجد کے ہاں سماجی حقائق کا مشاہدہ عصری آگہی اور سماجی حقیقت نگاری کا شعور دراصل ان کے سماجی اور طبقاتی شعور کا مظہر ہے یہی سماجی اور طبقاتی شعور انہیں اپنے عہد کے ترقی پسند شاعر کے مقام پر متمکن کرتا ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے سماجی اور طبقاتی شعور کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

## یوسف حسن کی شاعری میں سماجی اور طبقاتی شعور:

انسان کے ارتقا کی تاریخ طویل تر ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ اور دلچسپ بھی ہے۔ انسان نے غاروں سے نکل کر اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔ قبائل معاشرے سے آج تک کے جدید دور تک کا تمام تر سفر انسان کے سماجی شعور کا رہین منت ہے۔ مگر انسان کی اس اجتماعی کاوشوں سے بننے والی معاشرت کو کہیں نہ کہیں طبقاتیت آلودہ کرتی رہی ہے۔ قدیم اشتمالی معاشرے سے غلام داری معاشرہ غلام داری معاشرے سے جاگیر داریت اور جاگیر داریت سے سرمایہ داریت تک کا یہ سفر ذرائع پیداور پر ملکیت کا سفر ہے۔ جس کے نتیجے اس معاشرے میں طبقات پیدا ہوئے۔ اس تمام تر طبقاتی تاریخ میں انسان اس معاشرتی تقسیم کے خلاف نبرد آزما بھی رہے۔ انسان کا اجتماعی سماجی شعور تاریخ میں پیدا ہونے والی طبقاتیت کے خلاف ہمیشہ سے مزاحمت کرتا آیا ہے۔ انسان تہذیب کے آغاز سے آج تک اس مزاحمت میں بڑا حصہ ادبا اور شعرا کا بھی رہا ہے۔ ادیب کسی معاشرے کا نباض ہوتا ہے وہ اپنے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس مرض کا پتا چلاتا ہے اور بالآخر اس کے حل بھی تجویز کرتا ہے۔

اردو ادب کی بھی خوش قسمتی رہی ہے کہ اس کو ہر دور میں ایسے ادیب اور شاعر ہمیشہ میسر آئے جھنوں نے اپنے سماجی اور طبقاتی شعور کی بدولت ادب میں وقیع اضافہ کی۔ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک نے جہاں ادب میں قابل قدر اضافہ کیا وہیں اس تحریک نے بہت بہترین شاعر بھی پیدا کیے۔ ترقی پسند تحریک کی بنیادوں میں سوشلسٹ تحریک کا اثر بھی شامل رہا ہے اس لیے ترقی پسند ادیبوں میں بہت سارے سوشلسٹ ادیب اور شاعر شامل تھے۔

یوسف حسن ترقی پسند تحریک کے جدید تناظر کے اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری عصری زندگی کا بہت جامع احاطہ کرتی ہے۔ یوسف حسن خود مارکسسٹ تھے اس لیے ان کے ہاں مارکسزم ایک مضبوط حوالے کے طور پر ظاہر ہوتی ہے عابد حسن منٹو ان کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "پروفیسر یوسف حسن صحیح معنوں میں دانشور تھے۔ وسیع مطالعہ اور نظریے کی پختگی ان کی دانشوری کے مضبوط ستون ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے وہ مارکسسٹ تھے۔ تاہم وہ مارکسی سوچ رکھنے والے کئی دوسرے لوگوں کی طرح مارکسزم کو عقیدہ کے طور پر نہیں بلکہ سماجی سائنس کے طور پر برتتے تھے۔"(۷۴)

یوسف حسن ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کے ہاں ترقی پسندی گذشتہ ادوار کے دیے ہوئے فکر و فلسفہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ مسلسل ارتقا کرتی ہوئی فکر ہے جو کہ اپنے دور کی عصری زندگی کے تقاضوں اور مسائل سے مکمل ہم آہنگ ہے یوسف حسن جدید دور میں ترقی پسند فکر وسعت کے حوالے سے خود لکھتے ہیں۔

> "ترقی پسند فکر عمل اور اس کی ترجمانی انسانی زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ فنون لطیفہ سمیت سارے شعبوں میں ہو سکتی ہے اور اجتماعی یا انفرادی کسی بھی سطح پر مثالی ترقی پسند وہی ہو گی جہاں ترقی پسند فکر و عمل کے سارے عناصر پائے جائیں گے"۔(۷۵)

ترقی پسند ادب سے منسلک یوسف حسن کا سماجی شعور در اصل ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کی بدولت ہے۔ وہ اپنے سماجی شعور کے ذریعے سماج کا تجزیہ کرتے ہیں اور انسانی سماج کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ یوسف حسن کا سماجی شعور نہ صرف سماجی مسائل کا احاطہ کرتا ہے بلکہ وہ ایک ترقی پسند ادیب ہونے کے ناتے سے اپنی شاعری کے میڈیم کو استعمال کرتے ہوئے انسان اور اسی سماج کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی حریت، ہمت، شجاعت کے ساتھ ساتھ رجائیت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔

یوسف حسن کے طبقاتی شعور کا خمیر دراصل مارکسزم سے اٹھتا ہے۔ ان کی شاعری کی خاصیت بھی یہی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں مارکسزم کی سائنس کو سماج اور سماجی رشتوں کی تفہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یوسف حسن مارکسی ترقی پسند تھے وہ مارکسی ترقی پسند کی تعریف اپنے ایک مضمون میں یوں کرتے ہیں۔

> "مارکسی ترقی پسند فطرت اور انسان کے درمیاں دوگونہ رشتے کے بجائے سرگونہ رشتے کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فطرت اور انسان کے درمیان سماجی عمل کا رشتہ ہے۔ انسان اس سماجی عمل میں فطرت کو بھی اور اپنے آپ کو بھی تبدیل کرتا جاتا ہے خود انسان ایک تاریخی ہستی ہے"۔(۷۶)

یوسف حسن کی شاعری میں سماجی اور طبقاتی شعور عالمی سرمایہ داری نظام سے انسانی معاشرت میں پیدا ہونے والے بحران اور مسائل کی جاندار تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کے ہاں سرمایہ داری نظام کے خلاف رد عمل ملتا ہے۔ بالخصوص نیولبرل اکانومی سے پیدا ہوئے مسائل کو وہ بہت بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ نیولبرل اکانومی اور منڈی کی معیشت کے لئے ان کے ہاں "بازار" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے بازار یعنی مارکیٹ اکانومی کی اجارہ داری سے پیدا ہونے والے مسائل کو یوسف حسن اپنی شاعری بازار کی اصطلاح کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

بازار کی بندگی ہے یوسف
دربار کی آن بان کیا ہے(۷۷)

بازار کی بندگی جدید لبرل معیشت کی تباہ کاریوں اور اجارہ داری کی طرف اشارہ ہے اجارہ داری مارکیٹ اکانومی کا بنیادی اصول ہے۔ انسان اور انسانی رشتے اس بازار کی خدائی کے سامنے بالکل بے بس ہیں۔ یہ عصری زندگی کو درپیش سب سے اہم مسئلے کو طرف نشاندہی ہے۔ بازار کے مقابلے میں انسان اور اس سے جڑے رشتوں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی سماج حرص ہوس لالچ خود غرضی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک انسانی سماج اس نئے معاشی بندھن میں بندھ کر زر کو پوجنے لگتا ہے اور معاشرہ طبقات میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور شعر بازار کی اس اجارہ داری کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ جو کہ ان کے طبقاتی شعور کی دلالت بھی کرتا ہے۔

اے خدا دیکھ تیرے ہوتے ہوئے
ہم پہ بازار کی خدائی ہے(۷۸)

معاشی معاملات اور مارکیٹ پر کنٹرول ریاست کا کم سے کم ہو اور مارکیٹ آزاد ہو نیو لبرل اکانومی کا اصول ہے ۔ یوسف حسن کے ہاں بازار کی خدائی بنیادی طور پر اس نیو لبرل اکانومی کا اظہار ہے جس کے تحت انسانی زندگیوں پر مارکیٹ کا کنٹرول خوف ناک حد تک موجود ہے۔ اس نئے معاشی نظام میں انسان کی حیثیت محض ایک صارف کی سی ہوتی ہے۔ نیو لبرل معیشت انسانوں کے مابین مسابقت اور مقابلہ سازی کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ مسابقت اور مقابلے کا یہ عمل نئی اقدار کو جنم دیتا ہے۔ جس سے نئے معیارات پیدا ہوتے ہیں۔ اس مسابقت میں انسان مقابلے کی اندھی دوڑ میں بھاگتے ہیں۔ مارکیٹ کے طے کردہ معیارات کے مطابق صرف وہ انسان کامیاب ہے جس کے پاس زیادہ سے زیادہ دولت ہے یا جو زیادہ سے زیادہ قوت خرید رکھتا ہے۔ اس سارے عمل میں انسان اور انسانی رشتے غیر متعلقہ رہتے ہیں اور بازار کی خدائی برقرار رہتی ہے۔ بازار کا یہ تحکم اور اجارہ داری انسانی سماجی رشتوں کو آلودہ کرتا ہے۔ انسان ایک دوسرے سے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ سگے رشتے تک اس زر اور سرمائے کی ہوس میں بدل جاتے ہیں۔ یوسف حسن کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

بازار ہی بازار بھی دروں بھی ہیں بروں بھی
ہر رشتہ جاں رشتہ زر کس نے کیا ہے(۷۹)

انسانی معاشرت کو تباہ و برباد کرتا یہ نظام زر بنیادی طور ان پیداواری رشتوں کی وجہ سے ہے جو طبقاتیت کی بنیاد پر قائم ہیں۔ اس شعر میں بالخصوص رشتہ زر کی ترکیب سرمایہ دارانہ نظام میں پائے جانے والے ان معاشی اور

پیداواری رشتوں کی جانب اشارہ ہے۔ جو کسی سماج کو امیر اور غریب آقا اور غلام سرمایہ دار اور محنت کش حاکم اور محکوم جابر اور مجبور میں تقسیم کرتی ہے۔ اس لیے یوسف حسن کی شاعری میں سماجی اور پیداواری رشتوں کو نئے اور منفرد پیرائے میں بیاں کیا ہے۔ اختر عثمان اس حوالے سے رقم طراز ہیں۔

> " نظریے کی لو میں چلتی ہوئی یوسف حسن کی شاعری سماجی رشتوں سے متشکل ہوتی ہے۔ ان کی جمالیات اتنی نادر ہے کہ پیداواری رشتوں کو سمجھے بغیر اس پر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا یوسف حسن اصلاً مارکسی جمالیات کار ہیں۔"(۸۰)

یوسف حسن کا طبقاتی شعور اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ سرمایہ داری نظام میں پیدا ہونے والی دولت دراصل محنت کش طبقے کی محنت کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ وہ محنت کش کی قوت محنت کے قائل ہیں اور اس احساس سے بیگانے نہیں ہیں۔ اس بات کا گہرا شعور رکھتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام کی بھٹی میں جلنے والا ایندھن دراصل ان کے طبقے کے محنت کش اور مزدور ہیں اور اسی بھٹی سے پک کر جو کندن تیار ہوتا ہے۔ وہ محنت کش طبقے کی ہی بدولت ہے مگر اس کندن پر مزدوروں کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔

کوئی نہ جانے کوئی تو جانے
ہم ایندھن بھی ہم کندن بھی(۸۱)

مگر وہ اپنی محنت کے حق سے بیگانہ نہیں ہیں انھیں اپنی محنت کے حق کا پورا پورا احساس ہے۔ اسی لیے وہ پکار اٹھتے ہیں۔

بھوری مٹی میں مرے خوں کی شفق ہے کہ نہیں
اپنی ہستی پہ مرا بھی کوئی حق ہے کہ نہیں(۸۲)

"رشتہ زر" انسانوں کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچتا ہے۔ یہ انسانوں کو تقسیم کرتا ہے۔ طبقاتی معاشرے میں محنت کرنے والے طبقے کو اس کی محنت کی جائز اجرت نہیں ملتی مزدور محنت تو پوری کرتے ہیں مگر ان کی محنت سے حاصل ہونے والی دولت سرمایہ دار ہڑپ لیتا ہے اور یوں معاشرے میں طبقاتی خلیج بڑھتی رہتی ہے۔

مجھ سے تقسیم کیا رشتہ زر نے مجھ کو
جس نے بس میری مشقت کا خزینہ چاہا(۸۳)

رشتہ زر اور بازار کی اصطلاح میں خالصتاً نظریاتی بنیادوں پر یوسف حسن کی شاعری میں سماج میں پائی جانے والی تفاوت اور پیداواری رشتوں کو جبر اور استحصال کا اظہار ہے وہ اس طبقاتی استحصال رشتہ زر کے خلاف اپنی شاعری کے پیرائے میں احتجاج ریکارڈ کرواتے ہیں۔ ان کا خواب ایک ایسے سماج کی تعبیر ہے جو عدل و مساوات پر مبنی ہو جہاں انسانی اور سماجی رشتوں کی دولت کے پیمانے سے مت ماپا جائے۔ اس لیے وہ بازار کی بیعت کا انکار کرتے ہوئے سایہ زر سے پاک خالصتاً انسانی بنیادوں پر سماج کی تشکیل کی بات کرتے ہیں ان کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

وہ بھی نہ مجھے بیعتِ بازار میں چاہے
میں بھی نہ کبھی سایہ زر میں اسے دیکھوں(۸۴)

یہ دراصل طبقات سے پاک ایک ایسے سماج کا خواب ہے۔ جہاں سرمائے اور دولت کے مقابلے میں انسان کی قدر اور اہمیت ہو ایک ایسا سماج جو سرمائے اور دولت کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق نہ کرے۔ رمضان طاہر اس حوالے سے رقم طراز ہیں۔

"حکمران اور معاشرے کے بالادست طبقے نے جس طرح انسانوں کو خانوں میں بانٹ دیا اس کے خلاف یوسف حسن کی جدوجہد آخری دم تک جاری رہی یوسف حسن کی شاعری میں طبقاتی تقسیم کے خلاف بھرپور ادبی اقتباس سامنے آتا ہے۔ ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے ان کا خواب انسانی تاریخ کے اس منطق کے مطابق ہے جب سماجی عمل طبقاتی تقسیم کے آزاد رہ کر اپنے فطری تسلسل میں رواں دواں تھا۔ اس کے بعد کا دورانیہ جبر و استبدار کا ایک تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ طبقاتی تقسیم کے حوالے سے جدلیاتی انداز ہمیں یوسف حسن کے ہاں ملتا ہے۔ وہ اپنا اظہار کئی طرح سے کرتا ہے"۔(۸۵)

سماجی رشتوں کی اس نوعیت کو یوسف حسن مفادات سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں دراصل استحصالی رشتوں کے خاتمے کی خواہش ہے۔ مگر اس خواہش کے باوجود موجود کی حقیقت بہت تلخ ہے۔ جہاں ہر طرف بازار کا تحکم اور خدائی ہے۔ یہ تلخ اور کھردرا احساس یوسف حسن کی آئیڈیل دنیا سے میل نہیں کھاتا۔ وہ ایک ایسے سماج میں سانس لینے پر مجبور ہیں جہاں سانس لینا تک دشوار ہے۔ جہاں ہر طرف زر کی خدائی ہے۔ زر کی بیعت ہے وہ دولت کی اس ساحری کو دیکھتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں۔

یوسف ایسے کھوئے ہم بازار کے کے اسرار میں
آخری اپنی ذات بھی تحویل زر میں آگئی(۸۶)

یوسف حسن کی اس کیفیت کے حوالے سے ڈاکٹر رمضان طاہر لکھتے ہیں۔

"وہ استحصالی رشتوں کا خاتمہ بھی چاہتے ہیں اور سب کا اس دریا کی روانی اور عنایات پر حق بھی تسلیم کیے جانے کا اعلان کرتے ہیں۔ انسانی سطح پر سماج کا مطالعہ سب سے بڑا مسئلہ بازار اور معاش سے وابستہ تعلقات کو ٹھہراتا ہے بازاری لہجے بازاری رویے اور بازاری رشتے سب ہی شاعر کے آدرش سے مطابقت نہیں رکھتے سماج کی یہ عکاسی یوسف حسن کے ہاں بہت بار اپنا ظہور کرتی ہے۔ سب سے پہلے جو چیز انسان پر اثر انداز ہوتی ہے وہ اس کا وجود ہے۔ جب انسان اپنے جسم اور وجود کو بھی من چاہے طور پر نہ چلا سکے تو ایسے لمحوں میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ خود بھی بک چکا ہے"۔(۸۷)

اور اگر وہ نہ بھی بکے تب بھی اس طبقاتی سماج کے طے کردہ اصولوں اور معیارات کے خلاف اپنا آزاد وجود قائم رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ اور یوں انسان اس نظام کے رشتہ زر میں نہ چاہتے ہوئے بھی منسلک ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حساس انسان کے لیے بہت کرب ناک احساس ہوتا ہے۔ بازار کے جس اسرار اور سحر کا ذکر یوسف حسن کر رہے ہیں واقعتاً اس سحر سے انفرادی طور پر نکلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایک عام انسان کیا اس گرمی بازار میں عقیدے تک بدل جاتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام سے پیدا ہونے والی ثقافت کی اپنی ہی اخلاقیات ہوتی ہیں۔ جہاں ہر شے برائے فروخت کے ساتھ بازار میں بکنے کے لیے تیار ہوتی ہے حتی کہ انسان اور اس سے جڑی ہر شے اور اخلاقیات بھی:

لوگ تو لوگ عقیدے بھی پگھل جاتے ہیں
تم نے دیکھی ہی نہیں گرمی بازار ابھی(۸۸)

یوسف حسن کی شاعری سماجی حقیقت نگاری کا بیانیہ ہے اپنی شاعری کے ذریعے سسکتی انسانیت کے لیے امید وجا کی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ ان سماجی شعور سماج کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے تو ان کا طبقاتی شعور اس سماج میں ابھرے ہوئے تضادات کی نشان دہی کرتا ہے۔ یوسف حسن صحیح معنوں میں ترقی پسند ہے۔ ان کی شاعری جدید دور میں ترقی پسند ادب کا احیا ہے۔ وہ سماج کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اس مطالعے کی بنیاد پر ایک واضح اور دوٹوک موقف اپناتے ہیں اور کسی بھی نظریاتی کج روی کا شکار نہیں ہوئے بقول شفیق انجم:

"یوسف حسن عمر بھر سچے ترقی پسند داعی کی حیثیت سے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے والوں میں سے ہیں۔ جس صبح نو بہار کا غلغلہ ماضی قریب میں بلند ہوا اور جس نے قرنوں سسکتی انسانیت کے لیے امید کا ایک روشن زاویہ مرتب کیا یوسف حسن کو اس کا تنکا تنکا

ہو جانے کا غم تو ہے لیکن وہ مایوس بالکل نہیں۔ ان کی غزلوں میں اکثر و بیشتر شکست تمنا پر اظہار افسوس کے ساتھ ساتھ للکار کا ایک دبدبہ سا ضرور ابھرتا ہے۔"۔(۸۹)

## حوالہ جات


۱۔ بٹ، محمد افضال۔اردو ناول میں سماجی شعور مقالہ برائے پی ایچ ڈی(نمل یونیورسٹی،۲۰۰۶ ) ۲

۲۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز۔کشاف تنقیدی اصطلاحات (اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان اردو، ۲۰۱۸ ) ۱۶۶

۳۔ جاوید، ریاض۔طبقاتی شعور اور ادب(مشمولہ سویرہ شمارہ نمبر۹۔لاہور: نیاادارہ،۱۹۵۱ ) ۲۸

۴۔ پاشا، انور۔ہند و پاک میں اردو ناول تقابلی مطالعہ (نئی دہلی: پیش رو پبلی کیشنز، ۱۹۹۲) ۹۰

۵۔ رئیس، قمر۔کاظمی، سید عاشور۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ )۴۶۶، ۴۶۷

۶۔ حسن، یوسف، مضمون مشمولہ لفظ کھردرے (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹) ۱۹۴

۷۔ ایضاً، ۱۹۵

۸۔ سپرا، تنویر۔ لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶ )۲۹

۹۔ مارکس، کارل۔اینگلز، فریڈرک۔کمیونسٹ مینی فیسٹو (لاہور: فکشن ہاؤس۔۲۰۰۸) ۲۹

۱۰۔ سپرا، تنویر۔ لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶ )۳۰

۱۱۔ ایضاً، ۳۱

۱۲۔ ایضاً، ۴۱

۱۳۔ ایضاً، ۷۳

۱۴۔ ایضاً، ۹۰

۱۵۔ ایضاً، ۱۰۲

۱۶۔ ایضاً، ۹۸

۱۷۔ ایضاً، ۸۵

۱۸۔ ایضاً، ۱۱۴

۱۹۔ قاسمی، احمد ندیم۔صداقت کی شاعر مشمولہ تنویر سپرا اہل قلم کی نظر میں (لاہور: شرکت پرینٹنگ پریس، ۱۹۹۴ )۲۵

۲۰۔ سپرا، تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر،۲۰۱۶ ) ۶۵

۲۱۔ ایضاً، ۳۰

۲۲۔ ایضاً، ۸۴

۲۳۔ ایضاً، ۱۴۴

۲۴۔ ایضاً، ۱۴۵

۲۵۔ ایضاً، ۱۵۸

۲۶۔ حسن، یوسف، مضمون مشمولہ لفظ کھردرے (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹)۱۹۷

۲۷۔ سپرا، تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر،۲۰۱۶ ) ۱۵۶

۲۸۔ ایضاً، ۱۶۵

۲۹۔ ایضاً، ۱۰۳

۳۰۔ ایضاً، ۱۳۰

۳۱۔ ایضاً، ۸۹

۳۲۔ ایضاً، ۹۹

۳۳۔ ایضاً، ۷۴, ۷۵

۳۴۔ ایضاً، ۳۱

۳۵۔ ایضاً، ۵۸

۳۶۔ حسن، یوسف، مضمون مشمولہ لفظ کھردرے (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ ) ۱۹۷

۳۷۔ سپرا، تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر،۲۰۱۶ ) ۶۵

۳۸۔ ایضاً، ۶۷

۳۹۔ رائے پوری، اختر حسین۔ادب اور زندگی (دکن: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵ ) ۴۵۹

۴۰۔ جعفری، جواز۔ اقبال ساجد ایک ناراض خو شاعر مشمولہ کلیات اقبال ساجد (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴ ) ۱۸

۴۱۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ ) ۱۵

۴۲۔ ووڈز، ایلن۔ گرانٹ، ٹیڈ۔ مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ ) ۱۱۵

۴۳۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ )

۴۴۔ ایضاً، ۶۹

۴۵۔ ایضاً، ۸۷

۴۶۔ ایضاً، ۹۴

۴۷۔ جعفری، جواز۔ اقبال ساجد ایک ناراض خو شاعر مشمولہ کلیات اقبال ساجد (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴ ) ۱۸

۴۸۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ ) ۱۷۲

۴۹۔ حسن، سبط۔ موسیٰ سے مارکس تک (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۳ ) ۴۰۲

۵۰۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ ) ۲۱۲

۵۱۔ ایضاً، ۲۱۳

۵۲۔ ایضاً، ۲۱۴

۵۳۔ ایضاً، ۱۵, ۱۶

۵۴۔ ایضاً، ۶۱

۵۵۔ ایضاً، ۶۵

۵۶۔ ایضاً، ۶۶

۵۷۔ ایضاً، ۱۷۳

۵۸۔ ایضاً، ۱۴۹

۵۹۔ ایضاً، ۵۷

۶۰۔ ایضاً، ۶۸

۶۱۔ ایضاً، ۹۵

۶۲۔ ایضاً،۱۱۹, ۱۲۰

۶۳۔ ایضاً،۱۸۶

۶۴۔ ایضاً،۲۱۳

۶۵۔ ایضاً،۲۳۹،۲۴۰

۶۶۔ ایضاً،۱۵

۶۷۔ ایضاً،۴۳

۶۸۔ ایضاً،۲۰۷

۶۹۔ ایضاً،۲۲

۷۰۔ جعفری،جواز۔عہد جدید تر کا نمائندہ کون ہے مشمولہ کلیات اقبال ساجد (لاہور: جنگ پبلشرز،۱۹۹۴ )۴۱

۷۱۔ ساجد،اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد:بدلتی دنیا پبلی کیشنز،۲۰۱۷ ) ۲۱

۷۲۔ ایضاً،۴۵

۷۳۔ رائے پوری،اختر حسین۔ ادب اور زندگی (دکن:انجمن ترقی اردو،۱۹۳۵ )۱۲

۷۴۔ منٹو،عابد حسن۔پیش لفظ اے دل اے دریا (راولپنڈی:رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۱۹ )۷

۷۵۔ حسن،یوسف۔ترقی پسند اور ترقی پسندی مشمولہ بیاض (لاہور:بیاض گروپ آف پبلی کیشنز،۲۰۰۲ )۱۱۷

۷۶۔ حسن،یوسف۔ ادبی ترقی پسندی کے فکری و فنی مسائل مشمولہ نقاط مشمولہ نقاط (فیصل آباد،نقاط مطبوعات،۲۰۰۶ )۱۵

۷۷۔ حسن،یوسف۔اے دل اے دریا (راولپنڈی:رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۱۹ ) ۱۱۰

۷۸۔ ایضا،۱۱۱

۷۹۔ ایضا،۱۱۸

۸۰۔ عثمان،اختر۔فلیپ اے دل اے دریا (راولپنڈی:رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۱۹)

۸۱۔ حسن،یوسف۔ اے دل اے دریا (راولپنڈی:رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۱۹ )۷۲

۸۲۔ ایضا، ۱۲۷

۸۳۔ ایضا،۱۳۰

۸۴۔ ایضا،۱۳۸

۸۵۔ طاہر، رمضان۔ یوسف حسن کی غزل میں سماجی و طبقاتی شعور مشمولہ الاعجاز (ٹیاری: ستمبر ۲۰۲۱)۱۶

۸۶۔ حسن، یوسف۔اے دل اے دریا (راولپنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ )۱۴۰

۸۷۔ طاہر، رمضان۔ یوسف حسن کی غزل میں سماجی و طبقاتی شعور مشمولہ الاعجاز (ٹیاری: ستمبر ۲۰۲۱ ) ۲۰

۸۸۔ حسن، یوسف۔اے دل اے دریا (راولپنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ ) ۱۴۳

۸۹۔ انجم، شفیق۔یوسف حسن کی غزل گوئی مشمولہ جائزے (اسلام آباد: اسلوب، ۲۰۰۸) ۶۲

# باب چہارم

## احتجاج، انقلاب مزاحمت اور بغاوت کا ترقی پسند بیانیہ اور منتخب شعرا: تجزیہ و تقابل

انسان کے ارتقا کے سفر میں سماج کی تشکیل ایک بہت اہم واقعہ ہے۔انسان اپنے وجود اور معاشرے کو بر قرار رکھنے کے لیے ہمیشہ سے ہی حالات اور قدرتی آفات سے نبرد آزما رہا۔یوں موسمی تغیر سے آنے والے طوفان ،زلزلے،سیلاب ہوں یا پھر غیر فطری حالات سے پیدا ہونے والی مشکلات ہوں۔انسان ہمیشہ فطرت اور حالات کے خلاف مزاحم کار رہا ہے۔یہ مزاحمت کا جذبہ ہی تھا کہ انسان لاکھوں دیگر جانداروں کی نسبت فطرت کے جبر کے آگے ہمت ہارنے کی بجائے ڈٹا رہا۔

مزاحمت کا جذبہ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔اسی لیے چاہیے فطرت کا جبر ہو یا انسان کے اپنے بنائے حالات سے پیدا ہونے والا جبر ہو انسان نے ہر دور میں جبر و استحصال کے خلاف بر سر پیکار رہا ہے اور ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کیا ہے۔اسی لیے احتجاج کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسان کی۔انسانی سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ پیداواری رشتوں کے تبدیل ہونے سے معاشرہ بھی طبقات میں تقسیم ہوتا رہا ہے۔قدیم غلام داری سماج سے جدید صنعتی دور تک انسان نے طاقت اور دولت کی بنیاد پر دیگر انسانوں پر ظلم اور استحصال کی جہاں طرح طرح کی داستانیں رقم کی ہیں وہیں ہمیں تاریخ انسانی میں اس ظلم جبر اور استحصال کے نمائندوں کے خلاف احتجاج،بغاوت انقلاب اور مزاحمت کا یک طویل سفر نظر آتا ہے۔آقا اور غلام،کسان اور جاگیر دار،آجر اور اجیر،ظالم اور مظلوم کی اس طویل داستان میں جہاں نمرود،شداد،فرعون جیسے طاقت اور جبر کے استعارے نظر آتے ہیں۔وہیں ہمیں غلامی،جبر،اور استحصال کے خلاف غلاموں مظلوموں کی بغاوت اور مزاحمت کی درخشندہ روایت بھی نظر آتی ہے۔انسان کی فطرت ہے کہ وہ ظلم اور جبر سے نفرت کرتا ہے۔تاریخ کے سنہری اوراق پر(مزدک مانی،سقراط،سرمد،منصور)ہمیں سچ اور عدل کی خاطر ظلم کے خلاف مزاحمت کرنے والے عظیم الشان لوگوں کے نام ملتے ہیں۔انسان کی فطرت نے کبھی ظلم کو قبول کیا ہی نہیں۔کسی نہ کسی طور پر انسان اپنے اپنے دور کے استحصالی ڈھانچے کے خلاف مزاحمت کار رہے۔ان کے احتجاج،بغاوت اور مزاحمت کا انداز اپنا اپنا رہا ہے مگر اجتماعی طور پر انسانی دانش نے کبھی بھی جبر و استحصال کو قبول نہیں کیا۔رومن غلاموں کی بغاوت سے لے کر پیرس کمیون تک کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انسان ازل سے ہی ہر طرح کے استحصال کے خلاف مزاحم کار رہا ہے۔

اسی طرح صوفیا کا کردار بھی ایک مزاحم کار کے طور یاد کیا جاتا ہے۔بالخصوص منصور حلاج اور صوفی سرمد کا فلسفہ انسانوں پر انسانوں کی الوہیت اور ملوکیت کے خلاف ایک تازیانہ تھا۔جاگیر داری نظام کے استحصال کو مذہبی الوہیت اور ملوکیت کی سند عطا کرنے والے مذہبی طبقے کے خلاف صوفی سرمد، منصور حلاج، شاہ عنایت جیسے صوفیا کا کردار ایک باغی، انقلابی کا تھا۔اسی طرح بابا بلھے شاہ،وارث شاہ، بھگت کبیر، شاہ عبد الطیف بھٹائی، سچل سرمست،

میاں محمد بخش، شاہ امیر، امیر خسرو، باہو سلطان، فرید الدین گنج شکر، خواجہ غلام فرید جیسے عظیم صوفی شعرا کی شاعری وحدت انسانیت، عدل، مساوات، بھائی چارے اور انسان دوستی کا سبق دیتی تھی:

> "فکری سطح پر صوفیا کی تحریک نے خدا کی وحدانیت کو اپنا موضوع بنایا۔ مساوات انسانی کو فروغ دیا۔ بندہ و آقا کے درمیان حائل پردوں کو ہٹانے کی سعی کی اور کسی مخصوص زبان کی بالادستی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"(۱)

برصغیر میں صوفیا کے علاوہ ادب میں مزاحمت بغاوت، احتجاج یا انقلاب کا تصور نہ ہونے کے برابر ملتا ہے۔ گنتی کے چند شعرا کے علاوہ اردو شاعری زیادہ تر شاعر کے داخلی جذبات اور تجربات کی پیداوار تھی۔ عمومی شعری رویہ اور رجحان بھی یہی تھا کی شاعری واردات قلبی کا جمالیاتی اظہار اور تسکین طبع کا سامان ہے۔ اس لیے اردو شاعری اپنے اولین دور سے لے کر اٹھارہویں صدی کے آخری تک اپنے سماج سے کافی حد صرف نظر کرتی رہی۔ اس دوران میں شعرا اور ادیب انفرادی تجربات تو کرتے رہے مگر اس رجحان کو قبول عام حاصل نہ ہوا بلکہ اکثر و بیشتر شعرا اور ادبی حلقے اس کی مذمت کرتے رہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری اس کی واضح مثال ہے۔ ان کی شاعری جو کہ عوامی مسائل اور عام انسان کی زندگی کا خوب صورت شعری بیانیہ تھی، کو سوقیانہ اور بازاری زبان قرار دیا گیا۔ میر و غالب کے ہاں بھی اگرچہ دلی کے اجڑنے کا غم موجود ہے مگر یہ غم مزاحمت اور انقلاب کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام نظر آتا ہے۔ کلاسیکی عہد کی شاعری میں مرصع سازی اور فن جمالیات پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ شاعری کو داخلی اور قلبی واردات کے اظہار کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔ معاشرے اور معاشرتی مسائل کا احاطہ کرنا شاعری میں عیب تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے اردو شاعری کے آغاز سے لے کر کئی عرصے تک شاعری کے موضوعات اور خیالات میں خاص تبدیلی نہ آئی۔ روایت سے ہٹنے کو برا خیال کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں ہونے والی عظیم الشان تبدیلیوں سے بھی شعرا اور ادیب بے خبر تھے۔ اپنے گردوپیش سے بے خبر یہ شعرا مزاحمت اور انقلاب سے مکمل طور پر ناشناس تھے۔ اختر حسین رائے پوری اس دور کے حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پرواہ تھے ان کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے۔ پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے پیام موت تھی۔ ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں لے لیے تنزل کا اعلان تھا۔ اور ان سب سے اہم ۱۸۵۷ء کا سانحہ تو ہندوستان کی بربادی کا پیش

خیمہ تھا۔کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا؟ کتنے نوحے لکھے گئے؟"۔(۲)

کلاسیکی عہد کے بعد اگرچہ انجمن پنجاب کی تحریک،رومانی تحریک کی وجہ سے اردو کی روایتی شاعری میں موضوعات کا تنوع موجود تھا۔ فطری شاعری، ہیئت کے تجربات کے ساتھ ساتھ جذبے اور خیال کو اہمیت حاصل ہوئی مگر تاحال اردو شاعری میں خالصتاً انسان اور سماج کے مسائل کو موضوع نہیں بنایا گیا تھا۔ اگرچہ حالی، شبلی، آزاد نے اصلاحی انداز کی شاعری اور مقصدیت کو پہلی بار ادب اور زندگی کے تناظر میں پیش کیا۔ یہ رجحان کافی کامیاب ادب کا ایک پورا دبستان قائم کیا اس فکری رجحان نے باقاعدہ آگے چل کر تحریک کی شکل اختیار کی۔

رومانی تحریک بھی اسی رجحان کی مخالفت میں نمو پانے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے بیسویں صدی کے آغاز سے اس تحریک نے تقریباً سبھی ادیبوں کی تخلیقات پر اثرات چھوڑے۔ رد عمل میں پیدا ہونے والی اس تحریک میں اگرچہ عوامی مسائل، احتجاج، انقلاب، بغاوت، یا مزاحمت جیسے موضوعات کے بجائے جذبے اور عقل کو فروغ دیا۔ محمد حسن اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"رومانویت نے ہر جذبے کو اس کی انتہائی شکل میں پسند کیا۔ قوت وحیات کے مجسمے تراشے انہیں تابناکی اور تابندگی کے پرچم عطا کیے۔۔۔ رومانویت نے آزادی کا نام لیا تو مروجہ اصولوں کو توڑ کر نئے اصولوں کی تعمیر سے زیادہ مزاج فطرت کی طرف واپسی اور جذبے کی بے لاگ پرستش پر زور دیا انقلاب کا نام لیا تو انسانیت کی تمام تر مذہبی اور اخلاقی قدروں کی شکست وریخت ضروری سمجھی۔"(۳)

یہ تمام رجحانات اور تحریکیں جو کہ انقلاب و مزاحمت کے جذبے سے قطعاً عاری لگ رہی تھیں دراصل ایک سماجی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھیں۔ بیسویں صدی کا آغاز ہنگامہ خیز ثابت ہو رہا تھا۔ پہلی جنگ عظیم اور بعد ازاں اسی دورانیے میں انقلاب روس نے ہندوستان کے شعرا اور ادیبوں کے ذہن کو بھی نئے انداز اور زاویوں سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بعد ازاں ہٹلر اور مسولینی کی فاشسٹ تحریکوں اور دنیا کے اس عالمی منظر نامے نے لوگوں اور خاص کر ادیبوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ادیب ان اثرات کو تیزی سے قبول کر رہے تھے۔

ترقی پسند تحریک نے اس عالمی بحران میں شاعروں اور ادیبوں کو ایک فکری سمت مہیا کی۔ اردو ادب اور بالخصوص اردو شاعری نے یکسر اپنے مزاج کو تبدیل کیا۔ فرسودہ روایات اور موضوعات کے خلاف ایک رد عمل پیدا ہوا۔ معاشرتی جمود، سماجی ناہمواری اور معاشی عدم توازن کے خلاف مزاحمت، بغاوت اور انقلاب کی راہیں متعین

کیں۔ ترقی پسند تحریک نے اپنی ابتدا سے ہی ادب کے واضح خطوط متعین کیے اور انہی خطوط پر ادب کی تشکیل کرنے پر زور دیا۔ بنیادی ور پر اس تحریک میں مزاحمت، بغاوت اور انقلاب کے عناصر سوشلسٹ تحریک کے عطا کردہ تھے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب میں انقلاب کے تصور کو واضح کیا اور سوشلسٹ حقیقت نگاری کی طرح ڈالی۔ معاشرے میں پائے جانے والے استحصال اور جبر کے خلاف سوشلسٹ فلسفے سے پھوٹنے والی مزاحمت اور انقلاب نے ایک نئے بیانیے کو روشناس کروایا۔ ترقی پسند تحریک کے روح رواں سجاد ظہیر اس بابت لکھتے ہیں:

> "ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت ہمیشہ مصیبتیں اور آزمائشیں رہی ہیں اور رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشترا کی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔۔۔ اسی نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون حاصل ہوتا جاتا تھا۔" (۴)

ترقی پسند تحریک نے ادب کے جو اولین نقوش واضح کیے وہ جلد ہی اردو ادب کے شعرا ادبا کے ہاں مقبول ہو گئے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے اس انقلابی نقطہ نظر کے خدو خال اردو شاعری میں نظر آنے لگے۔ سماجی ناہمواری معاشی عدم توازن اور جبر و استحصال کے خلاف شعرا نے شاعری کو مزاحمت اور انقلاب کی آواز بنا کر پیش کیا۔ ادیبوں اور شاعروں نے ادب کو بغاوت کا اعلان نامہ قرار دیا۔ اختر حسین رائے پوری مجنوں گورکھپوری نے ادب اور انقلاب ،ادب اور زندگی کے نام سے مقالات اور کتب تحریر کر کے ترقی پسند تحریک کے بیانیے کی تشکیل کی۔

ترقی پسند تحریک کے مطابق ادب ایک سماجی عمل ہے۔ سماجی اور ادب لازمی و ملزوم ہیں۔ ایک ادیب تخلیقی عمل میں اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اس کے تخلیقی عمل پر اس کا خارج کسی نہ کسی شکل میں لازمی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک ادیب جو کہ معاشرے کا نباض ہوتا ہے وہ معاشرتی مسائل کو کڑی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان کو ادب کے ذریعے سامنے لاتا ہے اور وہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے نظر نہیں چراتا۔ اور مسائل کو ادب کے ذریعے سامنے لانے کے لئے وہ مزاحمت اور انقلاب کا سہارا لیتا ہے۔ ادب انقلابی روح بیدار کرے۔

> "ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔ ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہو گی"۔(۵)

ترقی پسند تحریک کے ذریعے مزاحمت بغاوت احتجاج اور انقلاب کا جو بیانیہ تشکیل پذیر ہوا۔ اس نے بالخصوص اردو شاعری میں ایک نئے جوش اور ولولے کو بھر دیا۔ اس دور کے تمام ترقی پسند شاعروں کے ہاں مزاحمت اور بغاوت کے عناصر نظر آتے ہیں مجاز، کیفی، علی سردار جعفری فیض، احسان دانش، جانثار اختر، حسرت کی شاعری میں انقلاب آفرینی اور مزاحمت کا فکری جوہر ترقی پسند تحریک سے ہی پھوٹتا تھا۔

ترقی پسند تحریک کے اولین دور میں تشکیل پانے والے بیانیے کے مطابق ادب انسانی زندگی کا آئینہ دار ہے تو ادب کے ذریعے معاشرے میں پائے جانے والے مسائل اور ان کے حل کی تلاش کو اولین فریضہ سمجھنا چاہئے۔ ایک ادیب کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ ادب کو سماج کی عکاسی کا ذریعہ بنائے۔ مجنوں گورکھپوری جو کہ ترقی پسند تحریک کے اولین نقادوں میں سے ایک ان کا بھی یہی ماننا ہے کہ ایک ادیب کو اپنے خارج میں ہونے والے مظاہر سے مکمل تعارف ہونا چاہیے۔ تبھی وہ سماج کی درست ترجمانی کر سکتا ہے:

> "جس زمانہ میں شاعر یا ادیب اپنی زندگی گزار رہا ہو اس میں تمام آدمیوں کی زندگی کی ایک کشمکش میں ہو اور پورے سماج کا ڈھانچہ بدل جانے والا ہو اور اس انقلاب یا زلزلہ کا عکس اس زمانہ کے شاعر اور ادیب کے کارناموں میں نظر آئے۔"(۶)

ترقی پسند ادب کے اس بیانیے کی وضاحت میں مجنوں گورکھپوری مزید لکھتے ہیں کہ ادیب چونکہ کوئی خلائی مخلوق نہیں ہے اس لیے وہ اپنے معاشرے سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے خارجی حالات سے لازماً متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ادیب یا شاعر کا اولین فریضہ سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے سماج کی نمائندگی کرنا ہے۔ وہ اپنے مقالے ادب اور زندگی میں مزید لکھتے ہیں:

> "ادیب کسی عالم بالا کی مخلوق نہیں ہوتا۔۔۔ ادیب ایک مخصوص دور اور مخصوص ہیئت اجتماعی اور ایک مخصوص نظام حیات کی مخلوق ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ کسان یا مزدور۔ اور ادب بھی خارجی اسباب و حالات سے اس طرح اثر قبول کرتا ہے جس طرح ہمارے حرکات و سکنات۔"(۷)

اسی طرح اختر حسین رائے پوری کا بھی یہی خیال ہے کہ ادیب کو ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف اعلان بغاوت کرنا چاہیے۔ وہ ایک ترقی پسند ادیب کو مزاحمت اور بغاوت کا درس دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک ترقی پسند ادیب کو مساوات، اخوت، موحدت انسانیت کا علمبردار ہونا چاہیے اور باطل اور ظالم طاقتوں کے خلاف مزاحمت اور بغاوت کا پرچم بلند کرنے والا۔ اختر رائے پوری لکھتے ہیں:

"ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب پر ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے۔ اسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہیے۔ اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے۔"(۸)

اختر حسین رائے پوری اس سماجی نظام کے خلاف بغاوت کا درس دیتے ہیں۔ جہاں انسان طبقات میں تقسیم ہو کر مختلف خانوں میں بٹ جاتا ہے۔ وہ مزدوروں کسانوں اور عام لوگوں کو اس نظام حیات کے خلاف مزاحمت کرنے پر اکسانے ہیں اور اس احتجاج اور بغاوت کے لیے وہ ادب کو سب سے بہترین ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ وہ سچے ادب اور ادیب کے لیے ایک تعریف متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سچ تو یہ ہے کہ ہم بھی سرمایہ داروں کی بساط کے مہرے ہیں۔ اپنی روٹیوں کے لیے ہم ان کے محتاج ہیں۔۔۔ ہمارا سماجی فرض تو یہ ہے کہ اس ماحول کو بدلیں اور نظام زندگی کی باگ ڈور ایسے طبقے کے ہاتھ میں دیں جو سماج کو ترقی کی طرف لے جائے گا۔ ہمیشہ کے لیے خانہ جنگی کو بند کر دیگا۔ انسان کا نہیں بلکہ انسانیت کا خادم بنادے گا۔"(۹)

اختر حسین رائے پوری کے مطابق حقیقی اور آفاقی ادب وہی ہوتا ہے جس میں سماج کو بدلنے کی قوت ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادب مزاحمت، احتجاج اور بغاوت کے رستے کے ذریعے سماج میں انقلاب کے لیے بنیادیں استوار کرتا ہے۔ اس لیے وہ ترقی پسند ادیب کا سماجی فریضہ انقلابی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ترقی پسند ادیب کا کردار ایک فوٹو گرافر کا سا ہوتا ہے۔

"میری دانست میں ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہماری شخصیت فوٹو گرافر بھی ہو اور مصور بھی ہو۔"(۱۰)

مجنوں گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری نے ادب اور انقلاب کے تصور کو بہت بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے نظریات سے ترقی پسند تحریک کے اولین دور کے بیانیے کی تشکیل اور تفہیم ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ادب کا اصلی جوہر اور آفاقی مقصد انقلاب کے لیے راہ ہموار کرنا اور ظالم طبقے کے بالمقابل مظلوم کی دادرسی اور آواز بلند کرنا کے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسے ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"دور حاضر کی سماجی جنگ میں اس طبقہ کی تائید کرنا جو ظالموں اور غاصبوں کے ہاتھ سے عنان حکومت چھین کر بنی نوع انسان کی آزادی کے علمبرداروں کو دے۔ ادب اپنا

سماجی فرض اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک اس طبقہ کا ہمنوا اور ہم گوش نہ
ہو جائے۔"(۱۱)

ترقی پسند تحریک کے مزاحمتی اور احتجاجی بیانیے کا جوہر اشتراکی انقلاب ہی نظر آتا ہے۔ معاشی ناہمواری میں بٹے ہوئے سماج کے خلاف بغاوت اور انقلاب کو ادب کا ابدی مقصد قرار دیا گیا۔ اس لیے بعد میں کی جانے والی تمام شاعری میں ہمیں ایسے نظام حیات کے خلاف بغاوت کا درس ملتا ہے جہاں صرف چند افراد کے ہاتھوں محکوم ہو کر ساری انسانیت بھوک ننگ اور افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ترقی پسند بیانیے کی تشکیل میں ترقی پسند شاعروں نے ایک انقلابی معاشرے کا تصور پیش کیا۔ اس انقلابی معاشرے سے طبقات کی نفی کی گئی۔ امیر اور غریب، کسان اور جاگیر دار، مزدور اور سرمایہ دار کے پیداواری رشتوں سے استحصال کے عنصر کو ختم کرنے کے لیے غیر طبقاتی سماج کی تشکیل کی خواہش نظر آتی ہے۔ اس لیے ترقی پسند ادیبوں کی بڑی تعداد اس مزاحمت اور بغاوت کے نتیجے میں ایک سوشلسٹ انقلاب کی تعمیر کے قائل تھے اور وہ کھلے عام اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ ترقی پسندی کا آخری سفر سوشلزم ہی ہونا چاہیے:

"محض ترقی پسندی ہی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔
اسے انقلابی ہونا چاہیے۔۔۔ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے
اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو انہی خیالات کی ترویج کرنی چاہیے۔"(۱۲)

ادب میں ترقی پسند ادب کے جس بیانیے کی تشکیل ہوتی اس کے مطابق ایک زندہ اور فعال شے کا نام ہے۔ ادب کا کام معاشرے کی درست عکاسی کرنا ہے ایک ادیب اپنے معاشرے سے کٹ کر خلاء میں ادب تخلیق نہیں کر سکتا تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے خارج میں ہونے والے حالات وواقعات کا مشاہدہ کر کہ انسانیت کی فلاح کے لئے کوئی راہ متعین کریں اور اپنے ادب کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں انقلاب اور مزاحمت کے جذبے کو بیدار کریں۔ جاگیر درانہ اور سرمایہ درانہ اقدار کے خلاف نئی اخلاقی قدروں کو اجاگر کریں تاکہ معاشرے میں وہ تمام اخلاقی امراض جو کہ ایک طبقاتی سماج کی دین ہیں کا سدباب کیا جا سکے۔

المختصر یہ کہ ترقی پسند ادب اپنے جوہر میں احتجاج، مزاحمت، بغاوت اور انقلاب کا درس ہے۔ ایک ادیب سماج کا سب سے حساس مبصر ہوتا ہے۔ اگر معاشرے میں غربت، بھوک، طبقاتیت، جہالت اور دیگر مسائل ہیں تو ایک ادیب پر سب سے اولین ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے ان مسائل کی نہ صرف عکاسی کرے بلکہ وہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے لوگوں کو مزاحمت اور انقلاب کے شعور سے بھی آراستہ

کرے ترقی پسند ادب کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ یہ ادب انسانوں اور سماج کے قریب ترین تھا اس ترقی پسند بیانیے کو بنیاد بنا کر شاعروں اور ادیبوں نے ادب کی تخلیق کی ترقی پسند تحریک کے عروج کے بعد جب اس تحریک کے عملی سطح پر خاتمہ بھی ہو چکا تھا تو اس تحریک کے انقلابی شعور اور مزاحمتی فکر نے آنے والی کئی دہائیوں تک شاعروں کو متاثر کیا یہی وجہ تھی کہ باقاعدہ تحریک کے خاتمے کے باوجود بھی یہ فکر ختم نہ ہو سکی۔ اس بات کا اندازہ اسی طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند فکر کے اس بیانیے نے آئندہ آنے والے سالوں کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا۔ اس لیے اگرچہ تنظیمی سطح پر تو تحریک کا خاتمہ ہو گیا مگر ترقی پسند بیانیہ انفرادی سطح پر تقریباً ہر شاعر کی فکر کا لازمی جزو بن گیا۔ ترقی پسند فکر کے اس بیانیے نے ادیبوں اور شاعروں کے لیے فکر کے نئے زاویے متعارف کروائے ۔ایک متبادل بیانیہ تشکیل ہوا۔ نیا ادب تخلیق ہوا جس کا مرکزی کردار زندہ انسان اور انسانی سماج تھا۔ ادب اور زندگی کے تعلق کو ٹھوس اور مظبوط بنیادیں فراہم کی گئیں۔

ترقی پسند تحریک کے اس نئے احتجاجی اور مزاحمتی بیانیے کی بدولت بعد میں آنے والے شعرا نے اپنے اپنے عہد کے مسائل کی ترجمانی کی اور ایک نئے سماجی نظام کی تعمیر کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ بقول یعقوب یاور:

> "سماجی شعور اور پختگی کا احساس بڑھنے لگا اور اس کے نتیجے میں اپنے عہد کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے اظہار کا رجحان، سماجی اصلاح کا رجحان اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کا رجحان بھی پیدا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری انفرادی اظہار کے جگہ اجتماعی مسائل کی ترجمانی کا ذریعہ بن گئی۔"(۱۳)

تقسیم اور اس کے بعد کے حالات سے پیدا ہونے والے مسائل اور سماجی جبر کے خلاف ادیبوں اور شاعروں کا مزاحمتی اور احتجاجی رویہ دراصل ترقی پسند بیانیے کا ہی جدید طرز انداز تھا۔ مگر شعرا نے عصری زندگی کے مسائل کی بھی خوب نمائندگی کی۔ مزاحمت اور انقلاب کا یہ تصور موجودہ دور کے ترقی پسند شاعروں کے ہاں بھی واضح انداز میں نظر آتا ہے۔

تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری ترقی پسند ادب کے بیانیے کی ایک واضح مثال ہے۔ ان منتخب شعرا کا کلام انقلاب، مزاحمت، بغاوت اور احتجاج جیسے عناصر کا بہترین مجموعہ ہے۔ زندگی اور اس سے جڑے مسائل، سماجی جبر، عصری زندگی کے نئے مسائل، کاپوریٹ کلچر کے استحصال، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، سامراجی لوٹ کھوسٹ، نیولبرل اکانومی کی چیرہ دستیاں منتخب شعرا کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ ذیل میں احتجاج

،انقلاب، مزاحمت اور بغاوت کے ترقی پسند بیانیے کے تحت تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری کا تجزیہ و تقابل کیا گیا ہے۔

تنویر سپرا کی شاعری میں احتجاج، انقلاب، مزاحمت اور بغاوت کا بیانیہ:

ترقی پسند تحریک کے خاتمے کے بعد انقلابی اور مزاحمتی شاعری کو انفرادی انداز میں برتنے کا تجربہ کئی شعرا نے کیا۔ ترقی پسند تحریک کے بیانیے پر متشکل ہونے والی شاعری میں ہر شاعر نے اپنے انفرادی رنگ کو برقرار رکھتے ہوئے تجربات کیے۔ ترقی پسند بیانیے سے وابستہ ان شعرا مزاحمتی ادب میں وقیع اضافی کیا۔ تنویر سپرا کی شاعری نئے دور میں اس بیانیے کی ایک بہترین مثال ہے۔ شاعری کے ذریعے تنویر سپرا نے عصری مسائل کی بھرپور نمائندگی کی۔ تنویر سپرا جو کہ خود مزدور طبقے سے تعلق رکھتے تھے شاعری میں بھی ایک مزدور کے جذبات کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تنویر سپرا کی شاعری نا صرف عصری زندگی کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے بلکہ وہ مسائل سے پاک ایک مثالی معاشرے کے قیام کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔

تنویر سپرا کی شاعری عصری زندگی کی زندہ اور ٹھوس عکس بندی ہے۔ وہ ترقی پسند ادب کے بنیادی اصول ادب زندگی کا ترجمان ہے پر پورا اترتے ہیں۔ اس لیے جہاں ایک طرف سماج کی بھوک، غربت، جہالت، ننگ، افلاس، بیماری، احساس محرومی کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسری جانب سپرا ایسے نظام حیات کے خلاف بغاوت کا درس دیتے ہوئے انقلاب اور مزاحمت کی نوید بھی سناتا ہے۔ سپرا کی شاعری مزدوروں، غریبوں محکوموں کی ترجمانی ہے۔ وہ اپنے سماجی شعور سے محنت کشوں کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔ رانا غلام شبیر تنویر سپرا کی شاعری راست گوئی اور بے باکی کی علامت دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "تنویر سپرا راست گو، بے باک اور حریت فکر کا علمبردار شاعر تھا۔۔۔ وہ دوٹوک لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا۔ محنت کش جس سماجی اور معاشرتی شعور سے آگاہ ہوئے ہیں تنویر سپرا کی شاعری میں اس کا واضح پرتو دکھائی دیتا ہے۔"(۱۴)

تنویر سپرا کی شاعری اپنے اردگرد کے حالات وواقعات کی داستان ہے۔ وہ سماجی جبر، استحصال اور ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

سماجی حقیقت نگاری ان کی شاعری کی روح ہے۔ وہ سماج میں پسے ہوئے طبقات کا استحصال دیکھتے ہیں تو وہ بے ساختہ اس طبقاتی نظام کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ اپنے اردگرد تڑپتے سسکتے انسانوں کو دیکھ کر شدت کرب سے چیخ اٹھتے ہیں:

گنبد کی طرح گونج اٹھے ساری خدائی
خواہش ہے میری آج میں زور سے چیخوں(۱۵)

یہ چیخ بنیادی طور پر مزاحمت اور بغاوت کی علامت ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں بدترین انسانی مشقت کرنے کے بعد بھی ایک مزدور کو بھوک اور غربت کے سوا کچھ نہ دے تو ایک حساس مزدور شاعر ایک ایسے نظام کے خلاف بغاوت کا درس دیتا ہے۔ احتجاج اور مزاحمت کی توانا آواز تنویر سپرا طبقاتی نظام حیات کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور اس نظام حیات کو زرد موسم سے عبارت کرتے ہیں۔ ایک ایسا زرد موسم بہار کی رنگینی کو نگل جاتا ہے۔ زرد موسم اور موسم گل کی علامتوں کے ذریعے وہ طبقاتی معاشرے کے خلاف مزاحمت کی آواز یوں بلند کرتے ہیں:

اب زرد رتیں ختم کرو زرد خداؤ
ہیں منتظر موسم گل سب کی نگاہیں(۱۶)

اپنے پیش رو ترقی پسند شاعروں کی طرح تنویر سپرا بھی ایک غیر طبقاتی سماج کا خواب دیکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ایسے غیر طبقاتی سماج کا خواب انسانوں کے مابین ہوس، لالچ، نفرت، بغض، مفاد پرستی کے بجائے امن مساوات، بھائی چارہ، احترام، دوستی قائم ہو۔ جہاں ہر قسم کے استحصالی پیداواری رشتوں سے بالاتر خلوص اور ہمدردی سے گندھے سچے رشتے قائم ہوں۔ جہاں کسی بھی انسان کی محنت کا استحصال نہ ہو اور دولت اور طاقت کی بنیاد پر انسانوں کا استحصال نہ ہو۔ وہ ایسے سماج کو ماں کے کردار سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کیوں کہ ماں ہی قربانی، خلوص، ہمدردی اور محنت کا پیکر ہوتی ہے۔

ایسا گھر تعمیر کریں جو سکھ رہنے میں ماؤں سا ہو
سردی ہو تو دھوپ صفت، گرمی ہو تو چھاؤں سا ہو(۱۷)

تنویر سپرا کی شاعری مزاحمت اور احتجاج کی خوب صورت مثال ہے۔ وہ سرمایہ دار طبقے کی منافقت اور ریا کاری کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ یہ طبقہ امن مساوات اور برابری کی بات تو کرتا ہے مگر ان کی باتیں محض تقریروں اور کاغذی وعدوں پر ہی محیط ہوتی ہیں حقیقت سے ان کا دور دور تک کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

بے پر کی کوئی بات نہیں چاہیے مجھ کو
تقریر مساوات نہیں چاہیے مجھ کو

مخلص ہوتو تقسیم کرو زر کو ابھی سے
وعدوں کی سیہ رات نہیں چاہیے مجھ کو(۱۸)

تنویر سپرا کے خیال میں جس مثالی سماج کا نقشہ ہے وہ اس شعر سے عیاں ہوتا ہے۔ جہاں عدل کی صرف ایک کسوٹی ہے اور وہ صرف "تقسیم زر" ہے۔ کیوں کہ معاشرے میں غربت سمیت تمام مسائل کی صرف ایک جڑ ہے اور وہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ طبقاتی معاشرے میں معاشرے کی اجتماعی دولت کی پیداوار تو سارا معاشرہ مل کر کرتا ہے مگر اجتماعی محنت سے پیدا ہونے والی دولت پر صرف چند فیصد لوگ قابض ہوتے ہیں۔ سپرا ایسے نظام حیات سے بیزار نظر آتے ہیں اور اس کے خلاف اعلان بغاوت بھی کرتے ہیں۔

حق بات کا اعلان سرعام کروں گا
میں آج یہی سوچ کر مجذوب ہوا ہوں
میری یہی پہچان ہے دنیائے ادب میں
مزدور ہوں مزدور کا مندوب ہوا ہوں(۱۹)

سپرا کی شاعری میں ایک مزدور کی بغاوت اور مزاحمت نظر آتی ہے۔ ایک مزدور کی زندگی جن جن مشکلات و مصائب سے گزرتی ہے۔ سپرا ان کو شعری لباس عطا کرتا ہے۔ سپرا کے الفاظ کھردرے ہیں ایسی سماعتوں کے لیے جو نازک مزاج ہیں۔ الفاظ کا یہ کھردراپن اور سختی اس سماجی نظام کی دین ہے۔ جہاں ایک عام محنت کش غیر انسانی مشقت کر کے بھی بے دست و پا ہی رہتا ہے۔ اس لیے سپرا کے ہاں بھی نرم و نازک الفاظ کی بجائے کھردرے الفاظ ملتے ہیں۔ بقول عبدالباری عباسی:

"اس کی شاعری میں نرم و نازک الفاظ جگہ نہ پا سکے بلکہ اس کے الفاظ سارے ہی کھردرے ہو گئے ہیں۔"(۲۰)

تنویر سپرا کو اپنے خشک مضمون اور تلخ لہجے کا احساس ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کے کھردرے الفاظ نازک سماعتوں پر بوجھ بنیں گے۔ اس لیے وہ پکار اٹھتا ہے

مضمون خشک ،تلخ زباں ،لفظ کھردرے
نازک سماعتوں پر مرے شعر بار ہیں(۲۱)

زبان کی یہ تلخی دراصل تلخی حیات کا پرتو ہے جہاں ہر شخص زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کا روزانہ مزہ چکھتا ہے۔ بھوک، غربت اور محرومیوں سے پیدا ہونے والے خیالات اور الفاظ تلخ اور الفاظ فطری طور پر کھردرے ہوتے ہیں۔ سپرا طنز اًنازک سماعتوں کو اس کیفیت سے خبر دار کر رہا ہے۔ کیوں کہ وہ لوگ جو زندگی کی ان صعبتوں کا سامنا نہیں کرتے ان کے لیے یہ الفاظ اور خیالات محض ایک بوجھ ہی ہوں گے۔ تنویر سپرا کے شعروں کی یہ خوبی ہے کہ وہ طنز کے انداز میں مزاحمت اور احتجاج کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ سماجی نظام کی خرابیوں پہ کہیں غصے سے کھولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں شدید طنز کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ وجہ کوئی بھی ہو ان کے لہجے کی یہ تلخ نوائی دراصل اسی نظام حیات کی دین ہے جس نے عام انسانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ جس کا ردعمل سپرا کے شعر ہیں۔

یہ عین فطری بات ہے جبر اور استحصال حد سے بڑھنے لگتا ہے تو اس کے خلاف رد عمل پیدا ہوتا ہے۔ مزدور طبقہ اپنی حق تلفی برداشت نہیں کرتا بالآخر وہ اس نظام سے بغاوت کر بیٹھتا ہے

اس لمحے مزدور سے ایک سپیرا بن جاتا ہے
جونک صفت زرداروں کا جب جمگھٹ ناگ سبھاؤں ساہو (۲۲)

ایک مزدور کو سپیرا بننے پر یہ نظام مجبور کرتا ہے۔ جہاں ایک مخصوص طبقہ سانپوں جیسی خصلت کا مالک ہو۔ جونک صفت زردار دراصل معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو پیراسائٹ طفیلیوں کی طرح دوسرے جانداروں کے جسموں پر پلتے ہیں۔ ساری زندگی اس جاندار کا خون نچوڑ کر پیتے ہیں۔ سپرا جس معاشرے کا رکن ہے اس میں بھی ایک قلیل طبقہ ان طفیلیوں کی طرح بغیر کسی محنت کے محنت کشوں کا خون پی کر پلتا ہے۔ بغیر محنت کے ان کی دولت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ زندگی کی سہولت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف بھوک غربت کے مارے ہوئے لوگ بنیادی ضروریات زندگی تک سے محروم ہوتے ہیں۔ تنویر سپرا کی "جونک صفت زرداروں" سے نفرت کی وجہ ہی یہی ہے کہ یہ طبقہ احساس انسانی سے یکسر محروم ہوتا ہے۔ ان سے جب محنت کا صلہ مانگا جاتا ہے تو یہ اس کو بھوک اور خیرات کی طرح عطا کرتے ہیں۔ تنویر سپرا اس بات پر سخت غم وغصے کا اظہار کرتا ہے اور اس جبر و استحصال کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ شوکت شاہی کے اس رعب و دبدبے سے انکار کرتا ہوا سپرا دعوت مزاحمت دیتا ہے:

میں نے جس وقت بھی محنت کا صلہ مانگا ہے
مجھ کو مرعوب کیا شوکت شاہی نے وہیں
میں نے روٹی کے لیے جب بھی زبان کھولی ہے
میرے ہونٹوں کو سیا ظل الٰہی نے وہیں(۲۳)

شوکت شاہی اور ظل الٰہی کی اس الوہیت اور ملوکیت کا خاتمہ تنویر سپرا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اپنی محنت کا ثمر حاصل کرنے کے لیے وہ ان جھوٹے خداؤں کے وجود کے خاتمے کو لازمی تصور کرتے درس بغاوت دیتا ہے

گر مجھے زیست سہولت سے بسر کرنی ہے
اپنی خوابیدہ اناؤں کو جگانا ہوگا
گر مجھے اپنی مشقت کا ثمر لینا ہے
دہر سے جھوٹے خداؤں کو مٹانا ہوگا(۲۴)

بغاوت سپرا کی شاعری میں طبقاتی نظام حیات سے پیدا ہونے والا سماجی رد عمل ہے۔ وہ اپنی زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں پر نظر دوڑاتا ہے، اپنے بچوں کی غربت اور بھوک کو دیکھتا ہے تو وہ اس محرومی سے نکلنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے یہ محض سپرا کی جذباتی کیفیت یا اس کی ذاتی تجربات نہیں ہیں بلکہ یہ اس کے ارد گرد کے زندہ انسانوں کی تصویر کشی ہے۔ اس لیے وہ ان حالات زندگی کو نہیں چاہتا جن میں اس کی نسلیں زندگی گزار کر گذر گئی ہیں۔ وہ اس صورت حالات سے نالاں ہے کہ وہ رہیں تکلیف سے ناگزریں جس وہ اور اس کا باپ گزرا ہے۔

مردوں کی طرح جس میں مرا باپ جیا ہے
وہ صورت حالات نہیں چاہیے مجھ کو(۲۵)

مگر مزید آگے چل کر وہ سسٹم کی زیادتیوں اور ناانصافیوں پر محض شکوہ کناں نظر نہیں آتا بلکہ وہ اس کے خلاف ایک رد عمل بھی رہتا ہے۔ یہ رد عمل دراصل بغاوت ہے۔ تنویر سپرا کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

کل تک ممکن ہے میں بھی بھرپور بغاوت کر بیٹھوں
آج اگرچہ شکوے با طرز جمہوری کرتا ہوں (۲۶)

زندگی کی محرومیوں کے خلاف بغاوت کا یہ رد عمل دراصل مزاحمت اور انقلاب کا درس ہے۔ کیوں کہ سپرا کو یہ بات معلوم ہے کہ یہاں جمہوری انداز میں کے گئے شکوے اور شکایات سرکاری دفاتر کے کوڑادانوں کی ردی بن جاتے ہیں

اور ان کی شنوائی کہیں بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے سپرا "بھرپور بغاوت" کا درس دیتا ہے۔ ایسے سماجی نظام کے خلاف بغاوت ہر حساس شاعر کا شیوہ ہوتا ہے جبر اور استحصال کے خلاف احتجاج اور مزاحمت سے سپرا کی شاعری کا خمیر اٹھتا ہے۔ ان کے اس احتجاجی رنگ کے حوالے سے انوار فیروز لکھتے ہیں:

> "تنویر سپرا سچا اور کھردرا شاعر تھا وہ حالات کی بھٹی سے کندن ہو کر نکلا اور اس نے جبر استحصال، گھٹن، چیرہ دستیوں کے خلاف آواز بلند کی جو اس کی شاعری میں احتجاج بن کر گونجتی ہے اسے احساس تھا کہ محنت مزدور کرتا ہے مگر اس کا پھل کر خانہ دار کھاتا ہے۔"(۲۷)

تنویر کی شاعری میں مزاحمت بغاوت اور احتجاج کے عناصر ان کے ترقی پسند شعور سے تشکیل پاتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ اس مزاحمت اور بغاوت سے ایک انقلاب کا تصور کشید کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کے بیانیے کے مطابق ایک ادیب کا اولین فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آرٹ کے ذریعے لوگوں کو انقلاب کے لیے تیار کرے۔

> "آنے والے انقلاب کے لیے ملک کو تیار کرنا اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلوں کو حل کریں۔ ان کو راستہ بتایئے"۔(۲۸)

تنویر سپرا کی شاعری میں بھی مزاحمت اور بغاوت حتمی طور جا کر انقلاب پر منتج ہوتے ہیں۔ سپرا کے ہاں بھی انقلاب کا ایک مخصوص تصور ہے۔ وہ ایک ایسے سماج کے قیام کے لیے خواب دیکھتا ہے جو ہر قسم کے طبقاتی آلائشوں سے پاک ہو۔ تنویر سپرا کے تصور انقلاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا تصور انقلاب غیر مبہم ہے۔ وہ کسی ابہام کا شکار نظر نہیں آتا منطقی انداز میں وہ اپنے شعروں میں طبقاتی نظام کو سرمایہ داروں وڈیروں اور جاگیرداروں کی دین قرار دیتا ہے۔ وہ سرمایہ داری اور جاگیردارانہ قدروں اور ان قدروں سے پیدا ہونے والے سماج کو نہ صرف غیر فطری قرار دیتا ہے بلکہ وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس طبقاتی نظام کے خلاف ایک جامع اور مربوط انقلاب کا تصور بھی پیش کرتا ہے۔ تنویر سپرا کا تصور انقلاب ترقی پسند بنیادوں اصولوں پر ہی تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی شاعری میں دو متحارب طبقات کی طبقاتی جنگ سے آنے والے انقلاب کا نقشہ ذیل اشعار سے کھینچتا ہے۔

او نچے اونچے کاخ گریں گے دھول اڑے گی لانوں میں
اب کہ ایسی جنگ چھڑے گی جھگیوں اور ایوانوں میں
اے جاگیروں کے مختارو اب وہ لمحے دور نہیں
سرخ پھریرے لہرائیں گے جب کھیتوں کھلیانوں میں(۲۹)

جھگیوں اور ایوانوں کی جنگ ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ہے اور اس نئے انقلاب کے خدوخال "سرخ پھریرے" کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ وہی سرخ پرچم ہے جو دنیا بھر کے محنت کشوں کی قوت اور محنت کا عالمی نشان ہے۔ جاگیر داری اور سرمایہ داری نظام کے خلاف مزدوروں کی اس عالمی ایکتا کا تصور سوشلزم سے ابھرتا ہے۔ سپرا کی شاعری میں سرخ پھریرے سرخ پرچم سرخ سویرا ہتھوڑے کا نشان سمیت مزدور تحریک سے جڑی تمام علامتیں دراصل ایک سوشلسٹ انقلاب کی علامتیں ہیں۔ سپرا نظام سرمایہ داریت کے خلاف جس سرخ انقلاب کی نوید سناتا ہے اس کا ہراول دستہ مزدور محکوم اور محروم المعیشت طبقہ ہے وہ طبقاتی نظام کی بڑھتی ہوتی خلیج کے خلاف بہت جاندار انداز سے تصویر کشی کرتا ہے، وہ انقلاب کی پیشن گوئی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اب کے گداگروں کے ہیں لہجے کھٹور سے
نعرے لگا رہے ہیں بڑے زور زور سے
ممکن نہیں کہ بچ سکیں نازک سماعتیں
چیخوں کی فوج بڑھ رہی ہے چاروں اور سے
نعمت کدے کو کھول دے ور نہ یہ زردلوگ
سرخی نچوڑ لیں گے تری پور پور سے
لگتا ہے اب یہ ہاتھ سے کشکول پھینک کر
چھینیں گے تم سے روٹیاں باہوں کے زور سے(۳۰)

"زردلوگ" دراصل طبقاتی سماج کا وہ کثیر طبقہ ہے جو ساری زندگی محنت اور مشقت کرنے کے باوجود بھوک ننگ اور افلاس کا شکار رہتے ہیں۔ ان کے چہرے بھوک اور نقاہت سے زرد ہوتے ہیں۔ ساری زندگی محرومیاں ان کا مقدر ہوتی ہیں۔ یہ شعر دراصل طبقاتی سماج پر بہت خوب صورت طنز ہے۔ ایک ہی سماج میں بننے والے دو طبقات کی زندگیوں کی عکاسی ہے۔ مزدوروں کے چہرے تو پیلے ہوتے ہیں ان کے چہرے نقاہت زدہ ہوتے ہیں مگر ان سرمایہ داروں کے چہرے سرخی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ سپرا کو اس طبقاتی تضاد پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

مِل مالک کے کتے بھی چربیلے ہیں
لیکن مزدوروں کے چہرے بھی پیلے ہیں(۳۱)

سرمایہ داری نظام کے استحصالی پیداواری رشتوں سے پیدا ہونے والا یہ بدترین عمل ہے۔ سپرا کے نزدیک یہ ایک ایسا نظام حیات ہے جو ایک کسان کو اس کی اپنی ہی پیدا کی ہوئی فصل سے محروم کر دیتا ہے اور ایک مزدور کو

اس کی ہی محنت سے پیدا کی گئی شے سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ محنت کے اس استحصال سے سماجی بیگانگی پیدا ہوتی ہے جس کو کارل مارکس تصور بیگانگی سے موسوم کرتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے طرز پیداوار کی سب سے بڑی خامی بھی یہی ہے کہ یہ محنت سے پیدا ہونے والی پیداوار پر محنت کش کا حق تسلیم نہیں کرتا۔ اس خامی کی وجہ ایک انسان جب اپنی محنت کے حق سے محروم ہوتا ہے تو وہ سماج سے کٹ جاتا ہے۔ مارکس کے تصور بیگانگی کے بقول:

> "مارکس کے نزدیک دور حاضر کی سب سے اہم معاشی حقیقت یہ ہے کہ محنت کار اپنے کام یعنی تخلیقی عمل سے جو چیزیں وہ پیدا کرتا ہے۔ ان سے شدید بیگانگی یا مغائرت محسوس کرتا ہے مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بیگانگی کا یہ دائرہ بالآخر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے لیے حتیٰ کہ اپنے جوہر ذاتی کے لیے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔"(۳۲)

تنویر سپرا اس سماجی نظام کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرتا ہے۔ مزدور طبقے کے لیے انقلاب کا متمنی ہے۔ اس لیے وہ ایک مزدور کو ہر ظالم کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا قائل ہے۔

خنجر نہیں تو نوک زباں ہی کو آب دے
ہر بو الہوس کی اینٹ کا پتھر جواب دے(۳۳)

تنویر سپرا سرمایہ داری نظام سے نفرت کرتا ہے۔ اس کے اشعار میں تلخ لہجہ اس بات کا غماز ہے کہ ایک مزدور ہونے کی حیثیت سے وہ سرمایہ داری نظام کے خلاف شدید غم و غصہ کا ظہار کرتا ہے۔ اس نفرت کی بنیادی وہ استحصالی پیداواری رشتہ ہے جس میں آجر اور اجیر ایک سرمایہ دار اور ایک مزدور منسلک ہوتے ہیں۔ سپرا اس استحصالی پیداواری رشتے کو توڑنے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے اگر آج اس نظام کو تبدیل کرنا ہے تو اس کے لیے انقلاب لانا پڑے گا اور ظالم کے اس نظام کے خلاف کَس کر وار کرنا پڑے گا تب جا کر ایک دائمی سکون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے سپرا اپکار اٹھتا ہے۔

گرم ہے لوہا، ہتھوڑا تھام، کَس کے وار کر
آج کی محنت کا حاصل دائمی آنند ہے(۳۴)

انسانیت دشمنوں کے خلاف سپرا کی شاعری صدائے احتجاج ہے۔ وہ اپنے قلم سے نکلنے والے الفاظ زمانے کے استحصالی عناصر کے لیے تازیانہ قرار دیتے ہیں۔ انسانیت کے دشمنوں کو وہ پیغام دیتے ہوئے پکار اٹھتے ہیں۔

اے قلم !انسانیت کے دشمنوں سے کر جہاد
دیر کے گندے عناصر کے لیے تو نیش بن(۳۵)

تنویر سپرا طبقاتی نظام حیات کے خلاف جو علم بغاوت بلند کرتا ہے وہ انقلاب کی نوید سناتا ہے۔ استحصالی نظام کی چیرہ دستیوں، گھٹن کے خلاف وہ مایوس نہیں ہوتا۔ وہ نظام سے پیدا ہونے والی محرومیوں غم و غصے کا شکار ہوتا ہے اور اس کے خلاف انقلاب اور بغاوت کی صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔

"ہمارے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر حساس شخص روتا ہے اور شاعر کا کرب اس کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے تنویر خود بھی گوشت پوست کا انسان اور حساس شخص تھا۔ وہ ان زیادتیوں اور جبر و تشدد ،استحصال پر کس طرح خاموش رہتا"لفظ کھردرے "صدائے احتجاج ہے اس ماحول اس معاشرے اس جبر و استحصال کے خلاف وہ احتجاج کرتے کرتے زندگی کی بازی ہار گیا۔"(۳۶)

تنویر سپرا کی حساسیت اس کی فکر و نظر کی دین ہے۔ وہ ہر سماجی واقعے کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ یہ شدت کرب اس کے شعور کا حصہ بن کر اس کی شاعری کو جلا بخشتی ہے۔

اردو کی انقلابی شاعری میں گذشتہ کچھ دہائیوں میں مضامین اور خیالات کو اس قدر دہرایا گیا ہے کہ بعض جگہوں پر کلیشے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ متعدد بار دہرائے گئے مضامین استعارے، تشبیہات نے نئے پن کے مواقع بہت کم کر دیے تھے۔ مگر بعض صورتوں میں نظریاتی فروغ کے لیے شاعری کو بطور پروپگنڈا استعمال کیا گیا۔ ترقی پسند بیانیے پر یہ ایک بہت بڑا اعتراض تھا۔ بالخصوص اولین دور کے ترقی پسند شعرا کے تجربات کے بعد مضامین اور خیالات کے اندر نیا پن لانا کافی مشکل کام تھا مگر تنویر سپرا کی خالص مزدور شاعری بھی عصری زندگی کی بہت بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"سپرا ایک غیر مبہم نقطہ نظر ایک اعلانیہ وابستگی کا شاعر ہے بعض عناصر ایسے شعرا کو "پروپیگنڈسٹ" کہتے ہیں میری گزارش ہے وہ تنویر سپرا کے سارے کلام کا بے تعصبی سے مطالعہ کریں وہ ایسا کریں گے تو انھیں معلوم ہو گا کہ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں پروپیگنڈے کو فن سے اور فن کو پروپیگنڈے سے الگ کرنا، ناخن کو گوشت سے جدا کرنے کے مترادف ہو جاتا ہے اور تنویر سپرا کا کلام اس کا شاہد ہے۔"(۳۷)

تنویر سپرا کی شاعری انقلابی عمل سے بھرپور بغاوت کا درس دیتی ہے۔وہ اپنے نظریے کی صداقت پر کامل اور غیر مبہم نظریہ رکھتا ہے۔اس لیے وہ مساوات کے لیے ہر آخری حد کو اپنانے کا درس بھی دیتا ہے۔اپنے اس انقلابی نظریے کو عملی شکل دینے کے لیے وہ تشدد کے استعمال کے قائل بھی نظر آتے ہیں۔اپنی نظم "وہ وقت یقیناً آئے گا" میں وہ انقلابی عمل کی تصویر کشی کرتے ہیں اور پر امید نظر آتے ہیں کہ یقینی طور پر وہ وقت آئے گا۔جب ہر ظالم کو یوم حساب دینا پڑے گا، دہقان اور محنت کش ظالم جاگیرداروں سے یوم حساب لیں گے۔یہ نظم دراصل دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے مختلف اشتراکی انقلابات کی لفظی پیکر کشی ہے، نظم ملاحظہ کیجیے:

جب دہقانوں کے کنبے خالی پیٹ نہ مرنے پائیں گے
جب محنت کش کی محنت کا پھل اس کے بچے کھائیں گے
جب موٹی موٹی توندوں پر ہاری کوڑے برسائیں گے
جب جاگیرداروں کے مختاروں پر کتے چھوڑے جائیں گے
جب سیٹھوں کی لاشوں کو چوکوں پہ لٹکایا جائے گا
وہ وقت یقیناً آئے گا
وہ وقت یقیناً آئے گا(۳۸)

تنویر سپرا کی شاعری کی یہ للکار ان کے انقلابی رنگ کو مزید گہرا کرتی ہے۔وہ ترویج مساوات کے لیے مزدوروں کو محنت گیر انقلابی شعور اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ سرمایہ داری اور جاگیر دار طبقہ جمہوری آوازوں کو محض مذاق سمجھتا ہے۔اس لیے سپرا کا شعور اس کو اس بات پر قائل کرتا ہے۔کہ وہ قارون کے بیٹوں کو براہ راست للکار کر شکست دے:

قارون کے بیٹوں مری للکار کو سن لو
ترویج مساوات یہاں ہو کے رہے گی
یا میرے بھی بچوں کو یہاں رزق ملے گا
یا آپ کی اولاد بھی فاقوں سے مرے گی(۳۹)

بلکہ سپرا اس سے آگے بڑھ کر محض امن عالم کا داعی بنے یا عالمی اخلاقی قدروں کے نام پر استحصال برداشت کرنے کا قائل نہیں ہے۔وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا قائل ہے مساوات اور برابری کے اصول پر زندگی گزارنے کا قائل ہے اسی لیے وہ کہتا ہے۔

ہر سپید و سیاہ کر ڈالو
انتقاماً گناہ کر ڈالو
امن اپنا مقدر نہیں تو
امن عالم تباہ کر ڈالو (۴۰)

مجموعی طور پر سپر اشاعری کا جائزہ لینے سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اس کی مزاحمتی احتجاجی اور انقلابی شاعری کا جوہر طبقاتی شعور ہے اور یہ طبقاتی شعور اشتراکی انقلاب فکر سے حالات اور عصری زندگی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ وہ ترقی پسند بیانیے کا جدید داعی ہے۔ اس لیے اس کی شاعری میں ترقی پسند بیانیے کی کلاسیک روایت کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی عکاسی اور نیا پن ہے۔ اپنے گردوپیش سے جڑا ہوا تنویر سپرا دراصل جدید ترقی پسند شاعر ہونے کی تعریف پر کافی حد تک پورا اترتا ہے۔

## اقبال ساجد کی شاعری میں احتجاج۔ انقلاب۔ مزاحمت، اور بغاوت کا بیانیہ: تجرباتی مطالعہ

اقبال ساجد کی شاعری احتجاج۔ انقلاب۔ مزاحمت، اور بغاوت کا مرقع ہے۔ ان کی اکثر و بیشتر شاعری ایک طبقاتی سماج کے خلاف بغاوت اور احتجاج کی آواز ہے۔ ترقی پسند ادیب کے بیانیے کے بقول بھی ایک ادیب کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے سماج میں ہونے والے جبر و استحصال پر خاموش نہ رہے بلکہ اس کے خلاف ادب کے عوامی میڈیم کو استعمال کرتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کرے۔ یہی وجہ تھی کہ تقسیم سے قبل ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے مقتدر سیاسی حلقوں کے خلاف حذب اختلاف کا بھرپور کردار ادا کیا نہ صرف معاشرے میں ہونے والے مظالم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی بلکہ ادب کے واسطے کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کی ذہنی اور شعوری تربیت کرتے ہوئے انھیں انقلاب کے لئے بھی تیار کیا۔

ادب کا سماج کے ساتھ ناقابل تنسیخ رشتہ ہوتا ہے ادیب جس معاشرے میں ادب تخلیق کرتا ہے۔ اس کے اثرات ہر صورت اس تخلیقی عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ اپنے خارج سے یکسر جدا ہو کر محض داخلی کیفیات سے ادب تخلیق نہیں کر سکتا اس لئے ایک ادیب اپنے گردوپیش کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس پر ناقدانہ رائے قائم کرتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے کی بنیاد پر معاشرتی مسائل کے خلاف ایک نظریہ یا فکر قائم کرتا ہے۔ اور معاشرے کی بہتری کے لئے ادب کے واسطے کو استعمال کرتا ہے۔

اردو کی ترقی پسند شاعری میں معاشرتی مظالم کے خلاف بھرپور احتجاج اور مزاحمت کا تصور ملتا ہے۔ بغاوت اور انقلاب ترقی پسند ادب کے بنیادی ترکیبی عناصر ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے عصری عوامی مسائل اور جبر واستحصال کے خلاف بھرپور احتجاجی آواز بلند کی ڈاکٹر محمد صادق اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "عصری زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا وقتی انتشار مذہبی تعصب فرقہ وارانہ فسادات سرمایہ داراور حکومت کا عوام پر ظلم ان سب کے خلاف ترقی پسندوں نے احتجاجی آواز اٹھائی"۔(۴۱)

ترقی پسند تحریک نے ادب کے لیے جو بیانیہ تشکیل دیا۔ اس میں احتجاج، انقلاب، مزاحمت، اور بغاوت اور انقلاب کے اجزائے ترکیبی بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔

اقبال ساجد کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے ان کی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کے عناصر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی شاعری کا کینوس انفرادی تجربات، معاشرتی بدحالی اور سماجی ابتری سے تشکیل پاتا ہے۔ اس کینوس پر وہ پھر اپنی شاعری سے مختلف رنگ بھرتے ہیں۔ اقبال ساجد کی زندگی کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ یہی گہرائی ان کی شاعری میں گہرائی اور عوامی جذبات کی کامل نمائندگی کی وجہ بنا ہے۔ بچپن میں تقسیم کے سانحے کو برداشت کیا۔ نئے ملک میں نئے خواب سجا کر آنے والوں میں شامل تھے ان خوابوں کو انتہائی خوف ناک انداز میں ٹوٹتے دیکھا۔ بھوک اور غربت کی مستقل کیفیت نے ان کے شعور پر بہت اثر ڈالا۔ تنگدستی اور محرومی کے احساس نے مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا۔ یہ وہ حالات اور واقعات تھے۔ جن میں اقبال ساجد کی شاعری میں مزاحمت بغاوت اور احتجاج زندگی کی تلخیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کے رد عمل کے طورر سامنے آتے ہیں۔ وہ بھوک، ننگ، افلاس، غربت، جبر واستحصال احساس محرومی، جہالت، مہنگائی، بے روزگاری، کے خلاف شدید رد عمل دیتے ہیں

غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا
غربت کی تیز آنچ پہ اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا؟(۴۲)

اقبال ساجد کا یہ شکوہ دراصل سماجی نظام کے ذمے داروں کے خلاف ایک مقدمہ ہے۔ وہ شکست وریخت کے شکار اس سماجی نظام پر طنز کر رہے ہیں۔ جس نے معاشرے کو بھوک اور فاقوں کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ شکوے کے انداز میں ان کا یہ احتجاجی نظام حیات کے اس ڈھانچے پر طنز کرتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جو

انسان سے اس کی بنیادی ضروریات زندگی کا حق تک چھین لیتا ہے۔ اس نظام حیات میں انسان کو زندگی سے رشتہ بر قرار رکھنے کے لیے ناپسندیدہ فعل تک کرنے پڑتے ہیں۔ اقبال ساجد کے مندرجہ اشعار ایسے متعفن سماجی نظام کے خلاف طنز کرتے ہوئے احتجاج کرتے ہیں۔

ہسپتالوں میں یہ کام بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپاری کرنا پڑا
چلتے پھرتے تھپیڑوں میں ایک جوکر کی طرح
ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا(۴۳)

یہ ایک ناکام ہوئے نظام کے خلاف شدید احتجاج ہے۔ ایک سماج کے نظام کی سب سے بڑی ناکامی معاشی طبقات میں بٹنا ہے۔ ان معاشی طبقات میں تقسیم ہونے کے بعد انسان ہر قسم کے اخلاقی جرائم میں بھی مبتلا ہوتا ہے۔ اور اخلاقی جواز بھی کھو دیتا ہے۔ اس سارے عمل کے پیچھے کسی بھی نظام کا معاشی نظام ذمہ دار ہوتا ہے۔ اقبال ساجد اپنی شاعری میں اس معاشی نظام سے سخت نالاں نظر آتا ہے اور اپنی ذات کے عیوب کو نشانہ بناتے ہوئے نظام کی ناکامی پر سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے۔

اقبال ساجد اس نظام حیات کے خلاف کڑھتا ہے اور اس کی یہ کڑھن اسے بغاوت پر اکساتی ہے۔ وہ مزاحمت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ زمانے کے اس اندرھے سماجی نظام کے خلاف خاموشی اختیار کرنے کے بجائے کس کر آواز لگانے کا درس دیتا ہے۔ اور سماجی گھٹن اور جبر کے خلاف بغاوت کی تلقین کرتا ہے۔ وہ جمود اور گھٹن کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے

دہر کے اندھے کنوئیں میں کس کے آوازہ لگا
کوئی پتھر پھینک کر پانی کا اندازہ لگا(۴۴)

حالات کے جبر کے خلاف اقبال ساجد ڈٹ جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ مزاحمت انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے۔ اور حالات کا جبر انسان کو ویسے بھی یہ لڑائی لڑنے کے لیے خود بخود تیار کر دیتا ہے۔

اک طرف حالات سے اور اک طرف دشمن کے ساتھ
خود کو لڑنے کے لیے تیار بھی کرنا پڑا(۴۵)

زندگی مزاحمت سے عبارت ہے۔ اقبال ساجد اس بات کا شعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ ان کو اپنے حق سے آگہی ہے۔ اس لیے وہ سورج کے چمکنے کا حق طلب کرتے ہیں۔

سورج ہوں چمکنے کا بھی حق چاہیے مجھ کو
میں کہر میں لپٹا ہوں شفق چاہیے مجھ کو(۴۶)

یہ حق طلب کرنا ہر انسان کا بنیادی انسانی حق ہے۔ چمکنے سے مراد یہاں پر ہر انسان کو اس کی خواہش اور مزاج کے مطابق زندہ رہنے کا حق تسلیم کرنے سے ہے۔ مگر ایک ایسا معاشرہ جہاں سوال ہی بنیادی ضروریات زندگی کا ہو وہاں بھلا دیگر انسانی حقوق کیا معانی رکھتے ہوں گے۔ ایسے سماج میں چمکنے یا شفق کی خواہش کرنا ایک شاعر کی زندگی کی خواہش تو ہو سکتی ہے۔ مگر سماجی سطح پر یہ محض خواب و خیال ہوتا ہے۔ قطع نظر ان تمام باتوں اقبال ساجد ادب کا خاص نظریہ رکھتا ہے اور وہ اس نظریہ فن کو محض ذاتی تسکین کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ترقی پسند ادب کے بیانیے کا قائل ہے کہ ادب کا ایک خاص منصب ہے، ادیب معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ آرٹ کو معاشرے کی اصلاح کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری اقبال ساجد کے اس فکری رجحان کا جائزہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"آج سے بہت پہلے میتھیو آرنلڈ نے ادب کو تنقید حیات کا نام لے کر ادب اور زندگی کے درمیان ایک نہایت مظبوط رشتے کی نشاندہی کی تھی بالکل اسی طرح اقبال ساجد کا نظریہ فن بھی تنقید حیات ہی ہے۔ وہ شعر کو صرف جمالیاتی تسکین کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اسے تنقید حیات سمجھتا ہے اور شعر سے اصلاح معاشرہ کا کام لینا ہے چاہتا ہے۔ وہ ایک نقاد کی طرح معاشرتی کمزوریوں ناہمواریوں اور خامیوں پر سے پردہ اٹھاتا ہے اور ایک مصلح کی طرح سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا ہے"۔(۴۷)

اس فکر و نظر کے تحت جہاں اقبال ساجد اپنے فن کو سماجی عکس بندی کا ذریعہ بناتا ہے۔ وہیں شاعری کے ذریعے وہ معاشرتی برائیوں اور خامیوں کو اپنے شعری تجربے کا حصہ بھی بناتا ہے۔ وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں اپنے گرد و نواح میں ہونے والے مظالم کے خلاف رد عمل ریتا ہے اور اس رد عمل میں وہ ظلم سہنے کو ایک گناہ تصور کرتا ہے ۔اقبال ساجد مزاحمت کو نئے مفاہیم عطا کرتا ہے۔ وہ معاشرتی برائیوں کے خلاف اعلان بغاوت کرتا ہے۔ وہ چپ رہ کر ظلم سہنے کو بزدلی سے تشبیہ دیتا ہے اور طاقت ور طبقے اور مظلوم کے مابین ہونے والے مظالم کا خلاصہ کرتا ہے۔ اس لیے اقبال ساجد پکار اٹھتا ہے۔

کچھ کہنا ایک گنہ اور چپ رہنا بھی گناہ
اپنے آپ سمندر ہو کر خود بہنا بھی ایک گناہ

طاقت اور کمزوری میں فرق یہی تو ہوتا ہے
ظلم بھی کرنا ایک ثواب اور سہنا بھی ایک گناہ(۴۸)

اس غزل میں اقبال ساجد طبقاتی سماج کے معیارات اور اخلاقیات کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ طبقاتی سماج کے خلاف ان کا احتجاجی انداز ہے۔ وہ ایسے سماج کے خلاف مزاحمت کار ہیں جہاں سرمائے سے محروم ہونا انسان کے لیے کس قدر کرب ناک ہوتا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں عزت اور شرف کی علامت سرمایہ ہی ہوتا یہ سرمایہ ہی ہے جو لوگوں کی زندگیوں کے معیارات طے کرتا ہے۔ پیسے کے حصول کی جنگ معاشرے کو اخلاقی طور پر قلاش دیتی ہے۔ اس طبقاتی معیار کے خلاف اقبال ساجد سراپا احتجاج ہے۔

سونا پاس نہیں ہے جن کے وہ مجرم کہلاتے ہیں
کانسی سے جو بنا ہوا ہے وہ گہنا بھی ایک گناہ(۴۹)

اظہار کر زباں سے کسی لفظ کے بغیر
چپ رہ، صدا کا رنگ نہ دے احتجاج کو(۵۰)

اقبال ساجد کی شاعری میں جبر اور استحصال کے خلاف شدید رد عمل ملتا ہے۔ وہ جبر اور استحصال کی ہر شکل کے خاتمے کو ضروری تصور کرتا ہے۔ ظلم اور استحصال کرنے والی قوت کے خلاف بغاوت اور مزاحمت کو فرض خیال کرتے ہیں اور ظلم اور جبر کو صبر سے برداشت کرنے کے بجائے اس کے سدباب کے لیے اس کی شاخ کو کاٹنے کی بات کرتے ہیں۔ اقبال ساجد کا مندرجہ ذیل شعر مزاحمت اور بغاوت کی خوب صورت مثال ہے۔

کاٹی نہیں تو اور بھی پھیلے گی شاخ جبر کی
صبر کی بات چھوڑیے ہوتی ہے حد بھی صبر کی
صبر کی بیل تو منڈھ چڑھ نہ سکی مرے خدا
دیر میں دھوم دھام سے رسم چلی ہے جبر کی(۵۱)

اس کی بغاوت اور مزاحمت ہی نہیں رکتی بلکہ وہ اپنے سماج کو اس جبر اور کٹھن سے نکال کر دم لینا چاہتا ہے۔ اقبال ساجد کی شاعری میں رجائیت کی ایک کیفیت ہے۔ اس رجائیت میں ایک حوصلہ اور ہمت ہے زندگی کی محرومیوں اور ناانصافیوں کے باوجود جینے کا ایک حوصلہ ملتا ہے اور حوصلہ انسان کو مزاحمت کرنا سکھاتا ہے۔ اور اس کے لیے نظام کا خاتمہ ضروری ہے۔

پہنائے وسعتوں کو نیا دائرہ کوئی
اس چرخ کو نظام کہن سے نکال دے(۵۲)

اقبال ساجد ظالم معاشرے کی ہر دلیل کا رد کرتا ہے۔ وہ ایسے سماج کے حق میں پیش کی جانے والی ہر گواہی کو باطل قرار دیتا ہے۔ جس معاشرے کے بطن سے بھوک، محرومی، غربت، مفلسی، ننگ، جرائم، کے علاوہ کچھ بھی پیدا نہ ہوتا ہو ایسا معاشرہ مٹا دینے کے قابل ہوتا ہے۔ اقبال ساجد اپنے معاشرے کے خلاف بغاوت اور مزاحمت کو فرض خیال کرتا ہے اور ایسے معاشرے کے حق میں استدلال پیش کرنے والوں کو ظالموں کا ساتھی قرار دیتا ہے اور انھیں سخت تنقید کا نشان بناتا ہے۔

ظالم معاشرے کی صفائی میں کچھ نہ کہہ
قاتل کے حق میں دے نہ شہادت کرائے پر(۵۳)

دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح اقبال ساجد کے احتجاج مزاحمت اور بغاوت عناصر سے انقلاب کا تصور ابھرتا ہے۔ اقبال ساجد جس نظام کے خلاف اپنے قلم کی قوت استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو صداقت کا علم گردانتا ہے۔ وہ اپنے اس دور میں جس میں سچائی کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے آواز بلند کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہے۔ شعر ملاحظہ کریں۔

بتا اس دور میں اقبال ساجد کون نکلے گا؟
صداقت کا علم لے کر اگر تو بھی نہیں نکلا(۵۴)

جھوٹ، نفرت، حسد، اور تقسیم پر مبنی بیانیے کے خلاف صداقت کا علم بلند کرنا ہر ادیب کا اولین فریضہ ہے۔ صداقت کا علم بلند کرنا ہر ادیب کا بنیادی اور اخلاقی فرض ہے۔ ایک سچے ادیب کی تخلیق کے لیے لازمی ہے ایک ادیب حق کی آواز پر لبیک کہے بقول اختر حسن رائے پوری:

"آج سچے ادب کی تخلیق صرف اس وقت ممکن ہے جب شخصیت ماحول کی مخالفت سے
بے نیاز ہو کر حق کے ازن پر لبیک کہے"۔(۵۵)

اسی صداقت کے علم کو بلند کرتے ہوئے اقبال ساجد انقلابی عمل پر یقین رکھتا ہے۔ وہ ظلم کے مقابلے میں حق کے پرچم کو بلند کرنے کے لیے جابر قوتوں کو دندان شکن جواب دینے کا قائل ہے۔ اس کی فکر میں جس انقلاب کا تصور ہے وہ ایک محکوم اور مظلوم کو اپنا حق لینے کے لیے اکساتا ہے اور حق وصول کرنے کے لیے اس شمشیر تک اٹھانے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ اقبال ساجد جانتا ہے کہ جبر واستحصال پر قائم ہونے والے سماج میں ایک مظلوم انسان کو اپنا حق

چھین کر لینا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ایسے گونگے سماج میں محکوموں، غریبوں اور پسے ہوئے طبقاتی کی آواز نہیں سنی جاتی۔ اقبال ساجد مظلوم طبقات کو اس انداز میں طبقاتی سماج کے خلاف دعوت انقلاب دیتا ہے۔

چپ کس لیے ہے، اینٹ کا پتھر سے ہے جواب ؟
حق چاہیے تو میان سے شمشیر کھینچ لے
مظلوم ہے تو پیش ہو، دربار وقت میں
انصاف چاہتا ہے تو زنجیر کھینچ لے(۵۶)

اقبال ساجد استحصالی قوتوں کے خلاف اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا قائل ہے۔ وہ اپنے تصور انقلاب میں ظلم کی ہر شکل کو خس وخاشاک کی اڑا دینا چاہتا ہے۔ طبقاتی بنیادوں پر تقسیم در تقسیم اور تفریق کرتی ہوئی بستی کو وہ ظلم بستی قرار دیتے ہوئے اسے مٹا دینے کی خواہش کا اظہار یوں کرتا ہے۔

اس ظلم کی بستی سے تو آندھی کی طرح اٹھ
اس شہر کی گلیاں خس وخاشاک سے بھر جا(۵۷)

بھوک، پیاس پر قناعت کرنے کے بجائے وہ دعوت عمل دیتا ہے۔

پیاسو! رہو نہ دشت میں بارش کے منتظر
مارو زمیں پہ پاؤں کہ پانی نکل پڑے(۵۸)

اقبال ساجد کی شاعری میں انقلاب اور سماج کی تبدیلی کے لیے مختلف علامتوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ وہ خون کے رنگ کو انسانی محنت اور جدوجہد کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری اپنے ایک مضمون میں ان کی اس انقلابی علامت نگاری کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں

"ساجد نے جس علامت کو اپنی شاعری میں سب سے زیادہ استعمال کیا ہے وہ ہے خون یا لہو کی علامت۔۔۔ خون کہیں انقلاب یا تبدیلی کی علامت ہے۔ کہیں محنت اور جدوجہد کے مفہوم لیے ہوئے ہے"۔(۵۹)

خون کی علامت کے استحصال سے اقبال ساجد انسانی محنت کے انقلابی تصور کو عصری معنویت عطا کرتا ہے۔ یہ بالکل جدا اور منفرد انداز ہے۔ اسی طرح سحر اور سرخ روشنائی کی علامتیں بھی انقلاب پر دلالت کرتی ہیں۔

الٹ دی شام کو سورج نے روشی کی دوات
فضا میں پھیلی گئی سرخ روشنائی دیکھ

وہ سطح گنگ و جمن پھر سے ہو گئیں رنگیں
لہو سے سرخ ہوئی سا حلوں کی کائی دیکھ (۶۰)

اقبال ساجد کی انقلابی شاعری میں رجائیت کا عنصر ایک نئی جدت لاتا ہے۔ شدید گھٹن اور حبس کے موسم میں یہ احساس زندگی کی نئی بہاروں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اندھیرے میں روشنی کی کسی رمق کے لیے انسان کو پر امید رکھتا ہے۔ نمو کی خواہش کے لیے انسان کو نئے آفتاب کاشت کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ رجائیت امید دلاتی ہے کہ اس خاک پر کسی نئی بہار کی آمد کو یقینی ہے۔

نمو کی خواہشیں رکھ کر سحاب کاشت کرو
پھر اس کے بعد نیا آفتاب کاشت کرو
خمیر خاک کسی روز رنگ لائے گا
زمین سنگ پہ ہر دم گلاب کاشت کرو(۶۱)

زندگی کی تلخیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کے باوجود اقبال ساجد کی شاعری مایوسی نہیں پھیلاتی وہ سماج میں موجود طرز معاشرت سے شکوہ کناں ضرور ہے۔ اسے مروجہ استحصال نظام سے شدید الرجک بھی ہے۔ وہ بھوک اور غربت کے ہاتھوں اکتایا ہوا بھی ہے مگر اس کے باوجود وہ ایک سورج کے مثل زندگی کی رمق چھوڑنے کی بات کرتا ہے۔ وہ اندھیروں کے تسلط کے خلاف سینہ سپر ہو کر لڑنے کی بات کرتا ہے۔ تاریکیوں کے مقابل روشنی کی بات کرتا ہے۔ جبر کے اس سلسلے کے خلاف آخری دم تک لڑ کر انسانوں کے زندہ رہنے کے حق کو حاصل کرنا اس کی شاعری کا مقصد ہے۔ یہی ایک انقلابی معاشرے کے لیے ادیب کی جدوجہد ہے۔

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا
اک روشنی کی موت مروں گا زمین پر
جینے کا اس جہاں میں حق چھوڑ جاؤں گا(۶۲)

مجموعی طور پر اقبال ساجد کی شاعری میں احتجاجی انداز مزاحمتی رنگ اور بغاوت و انقلاب کے عناصر کو ایک نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کے بیانیے کے مطابق ادب کا مقصد ہی طبقاتی میں منقسم معاشرے کے خلاف عوامی شعور کو مزاحمت اور انقلاب سے روشنائی کرنا ہے۔ اقبال ساجد کی شاعری کے تجزیے کہ بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ وہ دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح انقلاب کا کوئی بہت واضح ٹھوس اور جامع تصور نہیں رکھتے جیسے دیگر ترقی پسند شعر میں سے اکثر کے ہاں انقلاب سے مراد

اشتراکی انقلاب مراد لیا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اقبال ساجد کے ذہن میں جس انقلاب کا تصور ہے۔ اس میں وہ ایک مساوات پر مبنی غیر طبقاتی سماج کو پیش کرتے ہیں۔ جواز جعفری اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

"ساجد اس استحصال سسٹم اور اس سے وابستہ اداروں اور افراد کے چہرے سے نقاب کھینچتا ہے جو خود تو کبھی کوئی کام نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی محنت پر عیش کرتے ہیں جو تخلیق کار نہیں محض کنزولر ہیں۔ چناچہ ساجد جب ایک طبقے کی محنت پر دوسرے طبقے کو عیاشی کرتے دیکھتا ہے تو وہ اس ظلم پر چپ نہیں رہ سکتا"۔(۶۳)

## یوسف حسن کی شاعری میں احتجاج انقلاب مزاحمت اور بغاوت کا بیانیہ: تجزیاتی مطالعہ

ترقی پسند تحریک کے اثرات سے فکری طور پر متاثر شعرا اور ادیبوں میں یوسف حسن کا نام ہمیشہ اہمیت کا حامل رہے گا۔ یوسف حسن کی شاعری ترقی پسند بیانیے کی جدید اور عصری تعبیر ہے۔ طبقاتی طرز معاشرت کے خلاف ان کی فکر میں جو ردعمل ہے وہ بنیادی طور پر طبقاتی شعور کے بطن سے پھوٹتا ہے یوسف حسن کی شاعری میں طبقاتی نظام زندگی اور بالادست طبقے کے خلاف مزاحمت اور انقلاب کا گہرا شعور ملتا ہے۔ وہ ترقی پسند فکر کے حقیقی اور سچے ادیب تھے۔ بقول شفیق انجم:

"یوسف حسن ایک سچے ترقی پسند داعی کی حیثیت سے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے والوں میں سے ایک ہیں،،۔(۶۴)

یوسف حسن کی شاعری میں احتجاج، انقلاب مزاحمت اور بغاوت کے عناصر ترقی پسندی سے جنم لیتے ہیں۔ ان کی فکر میں مزاحمت اور بغاوت انقلاب پر جا کر منتج ہوئے ہیں۔ یوسف حسن کے ہاں انقلاب کا موہوم یا مبہم تصور نہیں پایا جاتا بلکہ وہ انقلاب کے ٹھوس اور خالص مفہوم کے قائل ہیں۔ ان کے انقلاب کے تصور کا جوہر مارکسزم ہے۔ وہ مارکس ترقی پسند کو فطرت اور انسان کے درمیان سماجی عمل کا رشتہ قرار دیتے ہیں۔

"مارکس ترقی پسند فطرت اور انسان کے درمیان درگونہ رشتے کے بجائے سرگونہ رشتے کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فطرت اور انسان کے درمیان سماجی عمل کا رشتہ ہے"۔(۶۵)

یوسف حسن کی شاعری پیداواری رشتوں اور سماجی حالات سے تشکیل پاتی ہے۔ وہ انقلاب کا ایک جامع مربوط اور واضح تصور رکھتے ہیں۔ یہ تصور انقلاب اس قدر واضح ہے کہ ان کی شاعری پڑھتے ہی ایک وحدت تاثر قائم ہوتا ہے۔ وہ پیداواری رشتوں میں استحصال زاویوں کو بالکل نئے در کھولتے ہیں۔ سامراجی صارفیت منڈی کی

معیشت، سرمایہ دارانہ استحصال پیداواری رشتوں، بازار کی اجارہ داری جیسے موضوعات سے یوسف حسن کی شاعری تشکیل پائی ہے۔ وہ عصری زندگی کے مسائل کو شعری معنویت میں اس قدر جاندار انداز میں پیش کرتے ہیں کہ مزاحمت اور انقلاب کا تصور بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مزاحمت اور رجائیت ان کے انقلاب کے بنیادی عناصر ہیں۔

ہم نے گھٹ گھٹ کے سلگنا نہیں سیکھا یوسف
درد وہ درد ہی کیا جو مشعل نہ ہوا(٦٦)

رجائیت اور امید انقلاب اور مزاحمت کے لیے انسان میں عزم اور حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ انسانی زندگی پر امید ظلم اور استحصال کے خلاف انسان کو ایک نئی صبح کی نوید سنائی ہے۔

آفاق کی ظلمتیں ہی کیا ہیں
ہم اپنا چراغ تو جلائیں
اک شام اجالنے کی دھن میں
بنتی گئی کتنی کہکشائیں(٦٧)

اندھیرے اور ظلمتیں ایک طبقاتی استحصال نظام کی علامتیں ہیں۔ جو انسانی زندگی سے روشنی اور امید کی تمام کرنوں کو چھین کر ان کے مقدر میں صرف اندھیرا لکھنا چاہتی ہیں۔

عروج پر ہیں اندھیروں کی سازشیں لیکن
پس غروب بھی تری جھلک نہیں جاتی(٦٨)

کس کو لو راہ سحر دیکھے گی
شام کی شام ہے شعلہ اپنا(٦٩)

تیرگی، روشنی، سحر، رات، اندھیرا، یوسف حسن کے ہاں دو متضاد نظاموں کی علامتیں ہیں، تیرگی، اندھیرا، رات اور تاریکی جبر فسطائیت اور طبقاتی نظام کی استحصال قوتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جبکہ چراغ، سحر، صبح، اور روشنی ،ان باطل اندھیروں کو رد کرتے ہوئے محنت کش طبقے کی مزاحمت اور احتجاج کی علامتیں ہیں۔

اے تیرگی !بجھا نہ چراغوں کے حوصلے
اے روشنی! سجھا نہ رہ مصلحت مجھے(٧٠)

رات کی تاریکی کی علامت کو یوسف حسن نے بار ہا استعمال کیا ہے۔ رات کی تاریکی دراصل نظام سرمایہ داریت کا وہ دورانیہ ہے جو انسانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیتا ہے۔ یوسف حسن اس لیے محنت کشوں کو تاریک رات یعنی ظلم جبر اور استحصال کے خلاف مزاحمت اور بغاوت کا درس دیتے ہیں۔

یوسف فقط ستاروں بھرے بھیس پر نہ جا
رات ایک واردات ہے شام و سحر کے بیچ(۷۱)

یوسف حسن کی شاعری زرد موسم میں کھلتی ہوئی کونپلوں کی مثال دے کر محنت کشوں کو "زرد موسم" کی سازش سے بچنے کو تلقین کرتی ہے۔ یہ زرد موسم معاشرتی گھٹن، جبر اور استحصال کی علامت ہے۔ جس کے خلاف مزاحمت اور بغاوت ہر انسان پر فرض ہوتی ہے۔

سایہ قد کی بڑائی پر نہ جا
ڈوبتے دن کی خدائی پر نہ جا
دیکھ شاخوں پر ہمکتی کونپلیں
زرد پتوں کی رہائی پر نہ جا(۷۲)

"دیکھ شاخوں پر ہمکتی کونپلیں" یہ مصرع بنیادی طور زندگی کی طرف دیکھنے کو مثبت زاویہ نظر ہے۔ اس زاویہ نظر سے انسان منفیت سے نکل کر زندگی کی رعنائیوں کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ معاشرے کی بد صورتی محکومی، صبر اور گھٹن کے خلاف اعلان بغاوت کر دیتا ہے۔

یوسف حسن انقلاب کے خالص مارکسی تصور کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی عظمت محنت امید رجائیت اور ایک ہمہ گیر انقلاب کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم ان کی مارکسی انداز نظر کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

> "یوسف حسن کی شاعری کارل مارکس کا انقلاب ورلڈ وژن نمایاں طور پر متحرک نظر آتا ہے۔ کارل مارکس نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو پیغام دیا تھا۔۔۔"دینا بھر کے محنت کشو متحد ہو جاؤ اس عمل میں تمھیں غلامی کی زنجیریں کے سوا کچھ نہیں کھونا۔۔یوسف حسن نے اپنی شاعری میں یہی سمجھا اور سمجھایا"۔(۷۳)

یوسف طبقاتی نظام کے خلاف جدوجہد کو معرکہ خیر و شر قرار دیتے ہیں۔ ان کے انقلابی بیانیے کے مطابق اس طبقاتی جنگ میں آنکھیں میچ کر یا غیر جانبدار رہ کر زندگی گزارنا منافقت و ریاکاری ہے اس لیے وہ اس طبقاتی

تصادم کے لیے محنت کشوں کو پیغام انقلاب دیتے ہیں۔ وہ انسانیت کو ایک نا قابل تقسیم وحدت قرار دیتے ہیں اور انسان کو اسی سماج میں اپنی ذات کی جڑت تلاش کرنے درس دیتے ہیں۔

دیکھ اپنا جشن ذات اسی شش جہات میں
آنکھیں نہ میچ معرکہ خیر و شر کے بیچ(۷۴)

یوسف حسن ہنگامہ ہستی کے قائل ہیں۔ وہ ایسی زندگی سے بے زار دکھائی دیتے ہیں جو بھرپور انقلابی جدوجہد اور عمل سے خالی ہو۔ اس لیے وہ ایک بھرپور سماجی عمل کے نتیجے میں طبقاتی نظام کی چولیں ہلانا چاہتے ہیں۔ اور ہنگامہ ہستی سے ہنگامہ حشر یعنی انقلاب برپا کرنے کے قائل ہیں۔

جس خاک میں ہنگامہ ہستی نہیں یوسف
اس خاک میں ہنگامہ محشر نہیں ملتا(۷۵)

یوسف حسن کی شاعری محکوم اور پسے ہوئے طبقات کی رزمیہ ہے وہ اپنی شاعری میں طبقاتی شعور سے استحصالی پیداواری رشتوں کو بہت عمدہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر رمضان طاہر

"یوسف حسن کی غزل اپنے عہد کے صاحب فکر اور باشعور شاعر اور فن کار کا تخلیقی اظہار ہے جو سماج کی تہہ در تہہ سچائیوں کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ اس کا کلام ایک فکری مجاہد کا رزمیہ ہے جو معاشرے کے محکوم طبقات کے حقوق کی فکری جنگ لڑتا دکھائی دیتا ہے"۔(۷۶)

یوسف حسن ترقی پسند بیانیے کے جدید شاعر ہیں انھوں نے جدید ترقی پسند شاعری کو عصری معنویت عطا کی۔ ترقی پسند تحریک کے بعد بحران کا جو دور گزرا اسے نئے دور سے ہمکنار کرنے والوں میں سے ایک یوسف حسن بھی تھے۔ ترقی پسندی میں واضح مارکس موقف کے حاصل یوسف حسن ترقی پسندی کو عقیدے کے طور پر نہیں اپناتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مارکسزم اور ترقی پسندی کو باہم آمیز کیا۔ ان کا یہ تجربہ ترقی پسند شاعری کا خوب صورت جمالیاتی اظہار ہے۔ عابد حسن ان کی ترقی پسندی اور مارکسی فکر تعلق پر لکھتے ہیں۔

"پروفیسر یوسف حسن صحیح معنوں میں دانشور تھے۔ وسیع مطالعہ اور نظریے کی پختگی ان کی دانشوری کے مضبوط ستون تھے۔ نظریاتی اعتبار سے وہ مارکسسٹ تھے تاہم وہ مارکسی سوچ والے کئی دوسرے لوگوں کی طرح مارکسزم کو عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ سماجی سائنس کے طور پر برتتے تھے"۔(۷۷)

یوسف حسن کی شاعری روایتی ترقی پسندی کے بجائے ایک انقلاب اور مزاحمتی انداز کی بنیادیں روایتی نظام کے خلاف انحراف پر مبنی ہیں۔ یوسف حسن فرسودہ طبقاتی نظام کے خلاف نجات کا واحد رستہ انحراف کو قرار دیتے ہیں۔ یہ انحراف بنیادی طور پر بغاوت اور انقلاب کا درس ہے۔

مری نجات رہ انحراف میں ٹھہری
گلے کا طوق مگر طرہ سلف کھلا(۷۸)

انسان کی اکملیت کی خواہش یوسف حسن کی شاعری کا اہم عنصر ہے۔ سماجی سطح پر وہ انقلاب کی تنظیم کے لیے ہر قسم کی فرسودگی اور رجعت پرستی اور رجعتی ڈھانچے کی شکست وریخت کے بعد انسان کی بھی فکری تعمیر ہوتی ہے۔ انسان کی بھی اس تہذیب نو میں فکری سطح پر از سر نو تشکیل ہوتی ہے۔ مگر اس سارے عمل میں پرانا فکری ڈھانچہ انقلاب کے ہاتھوں منہدم ہو جاتا ہے۔

عقیدے ٹوٹتے ہیں یوسف
مگر انساں مکمل ہو رہا ہے(۷۹)

مگر اس سماجی نظام کی تبدیلی کے خلاف وہ ایک ہمہ گیر اور مربوط انقلاب لانے کے تمنائی ہیں۔ ظلم کے نظام کے مدمقابل ایک منظم جدوجہد کا آغاز ہی امید کا واحد راستہ بن سکتا ہے۔

آفاق کی ظلمتیں ہی کیا ہیں
ہم اپنا چراغ تو جلائیں(۸۰)

ہم نہ اپنے دیے بجھائیں گے
کچھ بھی ہو رات کی مشیت میں(۸۱)

دیا اور چراغ یوسف حسن کی انقلابی علامتیں ہیں وہ طبقاتی نظام کے گھٹاٹوپ اندھیرے ہیں چراغ جلائے رکھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ رات یہاں جبر اور طبقاتی تقسیم پر مبنی سماج کا استعارہ ہے اور اس کے مقابل چراغ اس انقلاب اور مزاحمت کا جو اس رات کے وجود کی مسلسل نفی کرتے ہوئے جلتا رہتا ہے۔ یوسف حسن کے شعور میں چراغ انقلابی جدوجہد کی وہ راہ عمل ہے جو بالآخر اس گرانی شب میں کمی لائے گی۔

ہر اساں ہیں ہماری روشنی سے
جو ہم کو خوں میں نہلائے ہوئے ہیں(۸۲)

تہہ در تہہ علامتوں میں پوشیدہ یوسف حسن کی شاعری شعری معنویت میں اور بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ روشنی سے ہراساں ہونے والی قوت دراصل معاشرے کی وہ اشرافیہ اور باطل طاقت ہے جس نے معاشی جبر کے ذریعے سے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے اور اب اس پسے ہوئے طبقے کی بغاوت اور مزاحمت کی روشنی سے ہراساں ہے۔ تاریخ انسانی میں جب بھی پسے طبقات نے اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کی ہے کامیابی اور ناکامی دونوں صورتوں میں مقتدرہ خلق خدا سے ضرور خوف زدہ ہوئی ہے۔

یوسف حسن کی شاعری احتجاج، انقلاب اور مزاحمت کا عصری اور ترقی پسند بیانیہ ہے۔ یوسف حسن فرسودہ سماج کے مقابلے میں ایک جدید اور ترقی پسند سماج کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ ترقی پسند سماج کے اس ماڈل میں طبقات کا خاتمہ لازمی ہے۔ طبقات کے خاتمے کے لیے یوسف حسن سرمایہ دار طبقے کے مقابلے میں مزدوروں کے اندر احساس ملکیت پیدا کرنے چاہتے ہیں۔ یہ احساس ملکیت دراصل سماج کی دولت پر مالکانہ حقوق کے ہیں۔

خلق کیوں خود ہی نہیں فیصلہ کرتی یوسف
اپنے ہی گھر پہ ہمارا کوئی حق ہے کہ نہیں(۸۳)

مجموعی طور پر یوسف حسن کی شاعری میں احتجاج، انقلاب، مزاحمت اور بغاوت کے عناصر کی پیش کش ترقی پسند بیانیے کے بنیادوں اصولوں پر مشتمل ہے۔ سماجی اور پیداواری رشتوں، معروضی حقیقتوں اور عصری زندگی کی ترجمانی کو شاعری کے انداز میں یوسف حسن نے بہت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ فکری طرح ان کا میلان مارکسزم کی طرف ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں انقلاب کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بھی خالص مارکسی ہے۔ اس تصور انقلاب میں آزاد منڈی کی معیشت، سرمایہ دارانہ استحصالی پیداواری رشتوں طبقاتی طرز معیشت بازار کی اجارہ داری اور سامراجی صارفیت کے خلاف مزاحمت اور بغاوت کا ردعمل ملتا ہے۔ یوسف حسن کی شاعری ترقی پسند بیانیے جدید عصری آواز ہے۔

تقابل:

ترقی پسند تحریک نے زندگی اور ادب کا ایک متحرک اور جدید تصور پیش کیا۔ زندگی سے جڑے ہوئے اس انقلابی تصور نے ادب کے تخلیق مقاصد اور زاویوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ سماجی سطح پر یہ ایک بالکل نیا اور منفرد تجربہ تھا۔ ادب برائے زندگی کے اس نظریے پر تخلیق ہونے والا ادب زندگی کو ایک نئے اور الگ نقطہ سے سماجی جبر، معاشی تفریق معاشرتی گھٹن سمیت زندگی کے تمام مسائل کے خلاف مزاحمت احتجاج اور بغاوت کا ایک نیا سلسلہ

شروع ہوا۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے ادوار میں مزاحمت اور انقلاب کے اس بیانیے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا

موجودہ دور میں تنویر سپرا اقبال ساجد اور یوسف حسن اس ترقی پسند انقلاب بیانیے کی مثال ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عصری زندگی کے مسائل کو نہ صرف شعری لباس عطا کیا بلکہ اپنے اپنے سماجی اور طبقاتی شعور کی بساط کے مطابق طبقاتی نظام کے خلاف احتجاج مزاحمت اور بغاوت کا درس بھی دیا۔ ان تینوں شعرا کے ہاں ترقی پسند بیانیے کے معروضی تقاضے الگ ضرور ہیں مگر ہر شاعر انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی پسندی کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔ تنویر سپرا اقبال ساجد اور یوسف حسن جدید دور میں ترقی پسندی کے مضبوط اور مستند حوالے ہیں۔

تنویر سپرا کا انقلابی شعور ایک شاعر سے زیادہ ایک مزدور کے تجربے سے تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے تنویر سپرا کے ہاں تجربات اور مشاہدات کی وسعت کے ساتھ ساتھ ایک مزدور کی محرومیوں ناکامیوں اور تلخیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس معاملے میں اقبال ساجد کے ہاں بھی نظام سے پیدا ہونے والے مسائل اور محرومیوں کے خلاف بغاوت اور احتجاج کا ردعمل ملتا ہے۔ یوسف حسن کے ہاں انقلابی تصور معاشی ناہمواری کے خلاف ردعمل ہے۔ وہ سماجی اور پیداواری رشتوں کی تقسیم کے ذریعے فرد کے مسائل کو سامنے لاتے ہیں۔

تنویر سپرا اور یوسف حسن کی شاعری میں انقلاب سے مراد اشتراکی انقلاب ہے۔ سپرا اور یوسف حسن ذہنوں میں انقلاب کا جو تصور ابھرتا ہے وہ مارکسی انقلاب کا تصور ہے۔ یہ تصور واضح، غیر مبہم اور دوٹوک ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں اقبال ساجد طبقاتی نظام کے خلاف مزاحمت اور بغاوت کی بات تو کرتے ہیں مگر یہ مزاحمت اور بغاوت کسی واضح اور حتمی نتیجے پر منتج نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک ابہام ضرور رہتا ہے کہ آخر اقبال ساجد کے ذہن میں جو انقلاب کا نقشہ ہے اس کے ظاہری خدوخال کیا ہوں گے؟ وہ کسی نوعیت کا انقلاب لانا چاہتے ہوں گے۔ اقبال ساجد کی شاعری کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ اتھارٹی کے مقابلے میں فرد کی آزادی کے قائل ہیں۔ وہ فرد کی آزادی کے لیے مزاحمت کا شعور رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر تینوں شاعروں کی زندگی اپنی عصری زندگی سے مکمل علاقہ رکھتی ہے۔ نئے دور کے مسائل کی ترجمانی اور مروجہ استحصالی قوتوں کے خلاف مزاحمت اور انقلاب کا تصور بھی تینوں شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ مجموی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ تنویر سپرا اقبال ساجد اور یوسف حسن ترقی پسند بیانیے کی موثر اور جدید آواز ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳) ۱۵۰، ۱۵۱

۲۔ رائے پوری، اختر حسین۔ ادب اور انقلاب (دہلی: نیشنل ہاؤس، س۔ن) ۵۱

۳۔ حسن، محمد۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک (علی گڑھ: شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۵۵) ۱۵، ۱۶

۴۔ ظہیر، سجاد۔ یادیں مشمولہ گفتگو (بمبئی: وڈیرا پبلی کیشنز، ۱۹۸۰) ۷۸

۵۔ یاور، یعقوب۔ ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸) ۶۷

۶۔ گورکھپوری، مجنوں۔ ادب اور زندگی (گورکھپور: ایوان اشاعت، س۔ن) ۲۹، ۳۰

۷۔ ایضاً، ۵۱

۸۔ رائے پوری، اختر حسین۔ ادب اور انقلاب (حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳) ۳۶

۹۔ ایضاً ۱۱۴

۱۰۔ ایضاً ۱۱۵

۱۱۔ ایضاً ۱۱۵، ۱۱۶

۱۲۔ ظہیر، سجاد۔ یادیں مشمولہ گفتگو۔ (بمبئی: وڈیرا پبلی کیشنز، ۱۹۸۰) ۱۳۱، ۱۳۲۔

۱۳۔ یاور، یعقوب۔ ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸) ۲۰۲

۱۴۔ شبیر، رانا غلام۔ تنویر سپرا : کوہکن کی بات گئی کوہکن کے ساتھ مشمولہ ادبیات ، جلد ہفتم (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۴) ۸۵۳

۱۵۔ سپرا، تنویر۔ لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶) ۵۸

۱۶۔ ایضاً ۷۰

۱۷۔ ایضاً، ۱۶۱

۱۸۔ ایضاً، ۹۰

۱۹۔ ایضا، ۱۱۴

۲۰۔ عباسی، عبدالباری۔ تیکھی تحریریں (جہلم: تنظیم الادب، ۱۹۸۶) ۵۳

۲۱۔ سپرا، تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶) ۱۳۹

۲۲۔ ایضاً ۱۶۰

۲۳۔ ایضاً ۱۶۴

۲۴۔ ایضاً ۱۶۴

۲۵۔ ایضاً ۹۱

۲۶۔ ایضاً ۳۱

۲۷۔ فیروز، انوار۔تنویر سپرا کے لیے مشمولہ ، تنویر سپرا اہل قلم کی نظر میں (لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۴) ۴۴

۲۸۔ جعفری، سردار۔ گفتگو (بمبئی: وڈیرا پبلی کیشنز، ۱۹۸۰) ۳۲

۲۹۔ سپرا، تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶) ۶۷

۳۰۔ ایضاً ۹۸

۳۱۔ ایضاً ۸۴

۳۲۔ حسن، سبط۔موسیٰ سے مارکس تک (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۳) ۳۰۲

۳۳۔ سپرا، تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶) ۱۰۰

۳۴۔ ایضاً ۱۰۲

۳۵۔ ایضاً ۱۳۶

۳۶۔ فیروز، انوار۔تنویر سپرا کے لیے مشمولہ(تنویر سپرا اہل قلم کی نظر میں۔لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۴) ۴۴

۳۷۔ قاسمی، احمد ندیم۔صداقت کی شاعری مشمولہ لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶) ۲۰

۳۸۔ سپرا، تنویر۔لفظ کھردرے (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶) ۱۷۵

۳۹۔ ایضاً ۱۷۷

۴۰۔ ایضاً ۳۶

۴۱۔ صادق، محمد۔ترقی پسند اردو غزل کا آغاز و ارتقا (دہلی: کتاب دنیا، ۲۰۱۲) ۱۱۰

۴۲۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷) ۱۵، ۱۶

۴۳۔ ایضاً، ۲۲

۴۴۔ ایضاً ۱۹

۴۵۔ ایضاً، ۲۳

۴۶۔ ایضاً، ۴۰

۴۷۔ جعفری، جواز۔ کلیات اقبال ساجد (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴ ) ۳۶

۴۸۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ ) ۹۵

۴۹۔ ایضاً، ۹۵

۵۰۔ ایضاً، ۱۱۱

۵۱۔ ایضاً، ۱۱۹, ۱۲۰

۵۲۔ ایضاً، ۱۴۱

۵۳۔ ایضاً، ۲۱۳

۵۴۔ ایضاً، ۳۹

۵۵۔ رائے پوری، اختر حسین۔ ادب اور انقلاب (حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳ ) ۱۵

۵۶۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ ) ۴۲

۵۷۔ ایضاً، ۵۷

۵۸۔ ایضاً، ۵۴

۵۹۔ جعفری، جواز۔ عہد جدید تر کا نمائندہ کون مشمولہ تکمیل (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴) ۴۱

۶۰۔ ساجد، اقبال۔ تکمیل (اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ ) ۱۵۹, ۱۶۰

۶۱۔ ایضاً، ۲۲۰

۶۲۔ ایضاً، ۷۴

۶۳۔ جعفری، جواز۔ تکمیل (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴ )۱۰

۶۴۔ انجم، شفیق۔ یوسف حسن کی غزل گوئی مشمولہ جائزے (اسلام آباد: اسلوب، ۲۰۰۸)

۶۲

۶۵۔ حسن، یوسف۔ادبی ترقی پسندی کے فکری و فنی مسائل مشمولہ نقاط مشمولہ نقاط (فیصل آباد، نقاط مطبوعات، ۲۰۰۶) ۱۵

۶۶۔ حسن، یوسف۔ اے دل اے دریا (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹) ۲۰

۶۷۔ ایضاً، ۹۴

۶۸۔ ایضاً، ۱۲۵

۶۹۔ ایضاً، ۹۱

۷۰۔ ایضاً، ۶۷

۷۱۔ ایضاً، ۳۶

۷۲۔ ایضاً، ۹۸

۷۳۔ اقبال شمیم، آفتاب۔جہاں گری مشمولہ اے دل اے دریا (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹) ۱۳

۷۴۔ حسن، یوسف۔اے دل اے دریا (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹) ۳۵

۷۵۔ ایضاً، ۵۸

۷۶۔ طاہر، رمضان۔یوسف حسن کی غزل میں سماجی و طبقاتی شعور مشمولہ الاعجاز (ٹیاری: ستمبر ۲۰۲۱) ۲۴

۷۷۔ منٹو، عابد حسن۔پیش لفظ اے دل اے دریا (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹) ۷

۷۸۔ حسن، یوسف۔اے دل اے دریا (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹) ۶۷

۷۹۔ ایضاً، ۸۶

۸۰۔ ایضاً، ۹۴

۸۱۔ ایضاً، ۹۹

۸۲۔ ایضاً، ۱۰۷

۸۳۔ ایضاً، ۱۲۸

# باب پنجم

# ماحصل

بیسویں صدی انسان کی معلوم تاریخ کی سب سے ہنگامہ خیز صدی ثابت ہوئی۔ اس صدی میں انقلابات عالم برپا ہوئے۔ صنعتی ترقی کا عروج ہوا۔ عالمی جنگیں ہوئیں جن سے خوف ناک انسانی المیوں نے جنم لیا۔ دنیا نے نازی ازم فسطائیت اشتراکیت کی تحریکوں کو ابھرتے دیکھا۔ بیسویں صدی کے اس عالمی منظر نامے نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا۔ اسی طرح ادب بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ادب ادیب اور سماج چونکہ جزو لاینفک ہیں۔ اسی لیے ایک ادیب کبھی بھی اپنے سماج سے بیگانہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے خارج اور گرد و نواح میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہو رہا ہوتا ہے وہ اس سے کسی بھی صورت میں قطع نظر نہیں کر سکتا۔ خارج کے یہ اثرات اس کے داخل کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اب لازمی طور پر وہ جو بھی ادب تخلیق کرے گا وہ اس کے ماحول اور معاشرے کا عکس اور پرتو ہو گا۔ یہی وجہ تھی بیسویں صدی کے اس عالمی منظر نامے نے اردو ادب کو بھی متاثر کر کے نئے موضوعات نظریات اور جہات سے روشناس کروایا۔ عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کو ہندوستان کے ادیبوں نے محسوس کیا اور ادب کے روایتی اور فرسودہ طریقوں کو ترک کر کے ادب کے افادی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ بعد ازاں یہی فکر ترقی پسند تحریک کی موجب بنی۔

ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قبل ہی شخصی اور انفرادی طور پر کئی ادیبوں نے روایتی ادب کو خیر باد کہہ کر سماجی مسائل پر خامہ فرسائی کی۔ منشی پریم چند ترقی پسند تحریک سے قبل ہی انفرادی طور پر یہ تجربہ کر چکے تھے ۔ انھوں نے معاشرتی مسائل کو پہلی مرتبہ سنجیدہ طور پر موضوع ادب بنایا۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں سجاد ظہیر، احمد علی اور ان کے دیگر ترقی پسند ساتھیوں نے ترقی پسند تحریک کا منشور تیار کر کے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں لایا۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد ادب برائے ادب کے نظریے کے خلاف ادب برائے زندگی کے نظریے کو ادبا و شعرا میں متعارف کروانا تھا۔ معاشرے اور انسان سے جڑے مسائل جیسے بھوک پیاس، سماجی پستی، غلامی، مفلسی اور بیماری کو ادب کے ذریعے پیش کرنے پر زور دیا گیا۔ اس کے علاوہ سماجی رجعت پسندی کا خاتمہ، فرقہ پرستی، نسلی تعصب، انسانی استحصال، توہم پرستی کی مخالفت اور سائنسی عقلیت کا فروغ اس تحریک کا اہم مقصد تھا۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی سب سے اہم تحریک کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ اردو ادب کے ارتقا میں اس تحریک نے قابل قدر کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے توسط سے ادب میں وقیع اضافہ ہوا۔ اگرچہ ترقی پسند تحریک سے اختلاف بھی کیا گیا ہے مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تحریک گزشتہ صدی کی عہد ساز تحریک رہی ہے۔ اس تحریک نے نہ صرف اردو ادب سے فرسودگی اور روایتی پن کا خاتمہ کیا بلکہ ادب کی تخلیق کی رفتار کو تیز تر کیا ۔ اردو ادب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اجتماعی دانش کے ذریعے معاشرتی مسائل کو ادب کا پیراہن پہنایا گیا۔ پہلی مرتبہ انسانی مسائل بھوک، احتیاج، غربت، بے روزگاری، مذہبی منافرت، جاگیرداریت، سماج کی زبوں حالی، فرسودگی اور

بنیاد پرستی کو ادب کے موضوعات کے طور پر پیش کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادیبوں نے اسی نہج پر ادب تخلیق کیا۔

اردو ادب میں پہلی مرتبہ اس تحریک کے تحت سوالات پیدا کیے گئے کہ ادب کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟

ادب کی تخلیق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟

کیا ادب اور سماج کا کوئی تعلق ہے؟

ادب کی تخلیق کا محرک محض تجربہ ذات، قلبی واردات یا داخلی کیفیات ہیں یا خارجی واقعات سے پیدا ہونے والا عمل بھی اس کو متاثر کرتا ہے؟

کیا ادب محض تفنن طبع یا تسکین ذات کا نام ہے یا سماجی مسائل اور خارجی دنیا میں ہونے والی سرگرمیوں سے بھی ادب متاثر ہوتا ہے؟

ایک ادیب کا منصب کیا ہے؟

ایک ادیب کا طبقاتی و سماجی شعور کس قسم کا ہونا چاہیے؟

ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی؟

یہ کچھ بنیادی سوالات تھے جو ایک مخصوص قسم کے مادی حالات اور سماجی واقعات کے نتیجے میں پیدا ہوئے ۔ترقی پسند ادیبوں، نقادوں اور شاعروں نے اس تحریک کے زیر اثر ادب کے تخلیقی جوہر کو ایک نئی فکر سے روشناس کروایا جس کے نتیجے میں ایک پورا فکری رجحان کھڑا ہوا جس نے بعد میں ایک مکمل تحریک کی شکل اختیار کی۔ ترقی پسند نقادوں نے ادب کے نقوش متعین کیے۔ بالخصوص اختر حسین رائے پوری مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، احمد علی، احتشام حسین، عبد العلیم نے ترقی پسند تنقید سے ادب اور ادیب کے منصب اور فرائض پر بحث کی۔ اس بحث کے نتیجے میں ترقی پسند ادب واضح خدوخال کے ساتھ سامنے آیا۔

اس تحریک کے زیر سایہ نظم و نثر کی جملہ اصناف پر طبع آزمائی کی گئی۔ ناول، افسانہ، تنقید، نظم، غزل پر ترقی پسندیت کے ہمہ گیر اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ بالخصوص اردو شاعری میں مجاز، فیض، کیفی، ساحر، علی سردار جعفری، جوش، احسان دانش، ظہیر کاشمیری، مخدوم محی الدین نے ترقی پسندانہ موضوعات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں اردو ادب کے منظر نامے پر ابھرنے والی اس تحریک نے خوب عروج حاصل کیا۔ ادب کے مجموعی تخلیقی تناظر کو اس تحریک نے یکسر بدل کر رکھ دیا۔

اگرچہ پچاس کے عشرے کے بعد ظاہری طور پر اس تحریک کا خاتمہ ہو چکا مگر ادب برائے زندگی کے جس تصور کو ترقی پسند تحریک نے پیش کیا تھا اس فکر نے آنے والی کئی دہائیوں تک شاعروں اور ادیبوں کو متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے باقاعدہ اختتام کے بعد بھی آج تک ترقی پسند فکر کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد بھی شعرا اور ادبا نے انفرادی و اجتماعی سطح پر اس تحریک کو زندہ رکھا۔

ترقی پسند تحریک نے ادب اور زندگی کے جس تصور کا خاکہ پیش کیا اس تصور کو اردو کے زیادہ تر شعرا نے اپنایا۔ اس لیے جب تحریک کا خاتمہ بھی ہو گیا تو اس کے باوجود شعرا نے اس کو اپنی شاعری میں برتا۔ تحریک کے خاتمے سے ترقی پسند ادب کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ بعد میں آنے والے شعرا نے اس فکری تناظر کے نئے دور کے تقاضوں اور عصری معنویت کے نئے پیراہن عطا کیے۔ تقسیم کے بعد ترقی پسند فکر جس بحرانی دور سے گزری اس کے بعد بھی اس فکر کو زندہ رکھنے والے شاعروں نے سماجی حقیقت نگاری اور ادب برائے زندگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ تنویر سپرا، اقبال ساجد اور یوسف حسن کا تعلق بھی اس قبیل کے لوگوں سے تھا۔ جن کی شاعری عصرِ حاضر میں ترقی پسند فکر کا بہترین نمونہ ہے۔

تنویر سپرا کی شاعری کی کتاب "لفظ کھردرے" ہے جو ۱۹۸۰ء میں منصہ شعود پر آئی۔ سپرا بنیادی طور پر شروع سے بائیں بازو کے خیالات کے حامی رہے۔ تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ آمریت کے خلاف سینہ سپر رہے۔ اس لیے وقت آنے کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی اور انقلابی شعور میں بھی پختگی آئی۔ جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی نظر آتا ہے۔ تنویر سپرا کی شاعری ترقی پسند فکر کی بہترین ترجمان ہے۔ ان کی شاعری ادب اور زندگی سے وابستہ ہے۔ عوامی مسائل اور زندگی کے تلخ تجربات کو تنویر سپرا نے اپنی شاعری کے ذریعے بیان کیا ہے۔ تنویر سپرا کی شاعری میں عہد حاضر کے جملہ مسائل کو برتنا۔ اس بات کا غماز ہے کہ تنویر اسپرا ایک ترقی پسند فکر رکھنے والے شاعری ہیں۔ ان کی شاعری زندگی کے عصری مسائل کا عصری تقاضوں کے مطابق احاطہ کرتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے خاتمے کے بعد انفراد سطح پر فکری رجحان کو زندہ رکھنے والوں میں ایک اہم نام اقبال ساجد کا بھی ہے۔ اقبال ساجد کی شاعری میں سماجی و معاشی ناہمواریوں کو بیان کیا گیا۔ سماجی عدم توازن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اونچ نیچ اور سماج میں پائی جانے والی تفریق کے خلاف اقبال ساجد کے ہاں رد عمل ملتا ہے۔ وہ ایک ایسے نظام حیات کے خلاف سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں جو انسانوں کو منقسم کر کے غیر اخلاقی کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اقبال ساجد کی ترقی پسندی ان کی ذاتی زندگی کے تجربات کا بھی عکس ہے۔ جہاں وہ غربت، بھوک، بے روزگاری اور دیگر معاشرتی مسائل کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ وہ معاشرے کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں اور اکثر اوقات سماج کی اس جبری غیر منصفانہ تقسیم کا خود بھی شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے اقبال ساجد کے ہاں اس غیر فطری نظام کے خلاف

شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ ان کی ترقی پسند فکر ان کو سوچنے اور لکھنے کے نئے زاویے عطا کرتی ہے۔ اقبال ساجد کے انتقال کے بعد ان کی شاعری کا کلیات "اثاثہ" کے نام سے ترتیب دیا گیا ہے۔

ترقی پسند فکر کے عصر حاضر میں نئے فکری زاویوں اور جہات سے روشناس کروانے والو میں یوسف حسن بھی شامل ہیں۔ یوسف حسن کا شمار ترقی پسند فکر کے اہم رجحان سازوں میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند فکر کو عصری معنویت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ یوسف حسن کا کمال بھی ہے۔ انھوں نے ترقی پسند فکر کو آج کے دور کی زبان عطا کر کے عصر حاضر کے لیے بھی قابل عمل بنایا ہے۔۔یوسف حسن کی شاعری کا جوہر مارکسی ترقی پسندی ہے۔ وہ مارکسی فکر سے اعلانیہ وابستگی کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری پر ترقی پسند فکر کی چھاپ گہری ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ادب برائے زندگی کو نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسے عصری پیراہن عطا کرتے ہوئے نئے مفاہیم سے بھی روشناس کرایا۔ یوسف حسن کی شاعری کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری کی جڑیں سماج میں پیوست ہیں۔

اردو کے تقریباً تمام ترقی پسند شعرا نے اپنے اپنے درد اور معاشرے کے سماجی مسائل کا عکس اپنی مغائرت کو ختم کر کے سماج اور سماج سے جڑے مسائل کو ادب کے لباس میں پیش کیا گیا۔ دنیا نے جاگیر داری نظام کے بعد سرمایہ دارانہ عہد کے استحصال اور جبر کا سامنا کیا۔ دنیا میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد مسائل میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ ترقی پسند ادیبوں نے ان تمام حالات و واقعات سے پیدا ہونے والے مسائل کو ادب کے ذریعے سامنے لایا اور عوام کو شعور دیا۔ تنویر سپرا اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری میں بھی سماجی مسائل کو پیش کیا گیا۔

تنویر سپرا کی شاعری میں ایک عام مزدور کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ سپرا بذات خود ایک مزدور تھے۔ انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو انتہائی قریب سے دیکھا اس لیے ان کی شاعری میں انسانی مسائل کے بے دھڑک اظہار ملتا ہے۔ سماجی سطح پر طبقات میں منقسم نظام کے بطن سے پید اہونے والی بھوک، غربت، استحصال، جبر، لا قانونیت، بد عنوانی، افلاس، ننگ اور احساس محرومی کی انھوں نے شاعری کا کینوس عطا کیا۔ اس کے علاوہ سپرا کی شاعری میں گیر انسانی اوقات کار میں کی جانے والی مشقت، سرمایہ داری اور صنعتی نظام کی کوکھ سے جنم لینے والے جدید مسائل کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ شفٹوں اور اوور ٹائم کے ذریعے کی جانے والی اعصاب شکن محنت ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ ان کی شاعری میں عام انسان کی زندگی میں پائے جانے والے تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اقبال ساجد کے ہاں زندگی کی محرومیوں سے پیدا ہونے والی تلخ تجربات کا اظہار ملتا ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے معاشرے میں جو شدید اور خوفناک تضادات پائے جاتے ہیں۔ اقبال ساجد ان تمام تضادات کی اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ اقبال ساجد کی شاعری سماجی مسائل کا تاثراتی بیانیہ ہے۔ بھوک، غربت، جبر اور استحصال جیسے آفاقی مسائل کا ذکر ہو یا طبقاتی ناہمواری پر مبنی سماجی نظام کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوتی انسانی اخلاقیات اقبال ساجد نے اپنی شاعری کے ذریعے ایسے تمام مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ سماجی گھٹن، منافقت، ریاکاری، بے حسی، خود غرضی، لالچ، جہالت اور رشتوں کی بے گانگی جیسے مسائل کو بھی اپنی شاعری کے موضوعات میں استعمال کیا ہے۔

یوسف حسن کے ہاں زیادہ تر جن سماجی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے ان کا تعلق عالمی سامراجی اور سرمایہ داری نظام کے ماڈل سے ہے۔ ان کی شاعری نیو لبرل اکانومی کے استحصال اور اجارہ داری کے خلاف رد عمل کو موضوع بناتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مارکیٹ کی اجارہ داری کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں طبقاتی پیداواری رشتوں کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ یوسف حسن کے ہاں سامراج لوٹ مار اور طبقاتی تقسیم، سماجی گھٹن، عام انسان کی زندگی کی محرومیوں، جبر، استحصال، ناانصافی، منافقت اور طبقاتی عدم مساوات کا گہرا شعور ملتا ہے۔ طبقاتی نظام سے پیدا ہونے والے مسائل کو وہ اپنی شاعری میں علامتوں اور استعاروں سے بیان کرتے ہیں۔ بازار اور زر ان کے ہاں طبقاتی تضادات کی علامتیں ہیں۔ یوسف حسن کی شاعری میں جدید دور کے سماجی مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ وہ طبقاتی پیداواری رشتوں سے پیدا ہونے والے سماجی تضادات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ سماجی مشاہدے اور مطالعے کی بنیاد پر وہ ایک واضح اور دوٹوک مؤقف اپناتے ہیں۔ اس لیے یوسف حسن کی شاعری نظریاتی وابستگی کا واضح اعلان اور ترقی پسند ادب کا احیا ہے۔

ہر دور کے جبر و استحصال، لاقانونیت اور طبقاتی معاشرے کے خلاف ادیبوں اور شاعروں نے بھرپور جدوجہد کی ہے۔ ترقی پسند فکر سے منسلک شاعروں اور ادیبوں نے صدیوں سے مروجہ روایتی ادب برائے ادب کے نظریے کے برخلاف ایک نئی فکر کی شمع کو روشن کیا۔ اس فکر کے مطابق ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیا گیا اور سماج میں ہونے والی ہر قسم کی تفریق، تقسیم، ظلم و بربریت کے خلاف ادب کی مزاحمت، بغاوت، احتجاج اور انقلاب کا علمبردار قرار دیا گیا۔ ترقی پسند فکر سے تشکیل پانے والے اس بیانیے نے روایت پسندی، فرسودگی، رجعت پسندی، بنیاد پرستی کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس بیانیے کے تحت جاگیر داری اور سرمایہ داری اقدار کے خلاف بھرپور مزاحمت اور بغاوت کا اعلان کیا گیا۔ یہ احتجاج اور بغاوت دراصل ایک غیر طبقاتی عدل پر مبنی سماج کے قیام کا خواب تھا۔ لہذا اس نئے اور جدید ادب کے بقول ادب کے انقلاب کا بیانیہ قرار دیا گیا۔ اس فکر کی مقبولیت کا یہ ثبوت تھا کہ تنظیمی سطح پر

خاتمے کے باوجود اس انقلابی و مزاحمتی شعور نے بعد میں کئی دہائیوں تک شاعروں اور ادیبوں کو متاثر کیا۔ اس لیے مزاحمت اور انقلاب کا یہ شعور موجودہ اور کے شاعروں کے ہاں بھی کار گر ہے۔ تنویر سپرا اقبال ساجد اور یوسف حسن کی شاعری ترقی پسند فکر سے نمو پانے والی مزاحمت، احتجاج، بغاوت اور انقلاب کی واضح اور بہترین کارپوریٹ کلچر کے استحصال، مارکیٹ اکامونی سے پیدا ہونے والے مسائل، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، سامراجی لوٹ کھسوٹ، سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں کے خلاف اور مزاحمت کی صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے۔

تنویر سپرا کی شاعری سماجی حالات و واقعات کی داستان ہے۔ احتجاج، بغاوت اور انقلاب سپرا کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ وہ طبقاتی نظام حیات کے خلاف سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں۔ مزاحمت اور بغاوت کا درس دیتی ہوئی سپرا کی شاعری مزدوروں اور عام لوگوں کو انقلاب کی نوید بھی سناتی ہے۔ سپرا اپنی شاعری میں ہر قسم کے جبر و استحصال کو نظام سرمایہ داریت کی دین قرار دے کر اس نظام کے خاتمے کی بات کی گئی ہے۔ سپرا انقلاب کے ذریعے ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام کا خواب دیکھتا ہے جہاں تمام انسان مساوات، جمہوریت اور برابری کی بنیاد پر زندگی گزار سکیں۔

اقبال ساجد کے ہاں مزاحمت اور احتجاج زندگی کی تلخیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کے رد عمل کے طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری سماجی نظام کے خلاف مقدمہ ہے۔ وہ طبقاتی نظام حیات اور تقسیم در تقسیم پر مبنی سماجی ڈھانچے کے خلاف بغاوت اور انقلاب کا شعور رکھتے ہیں۔ وہ انسانوں کے مابین تفریق کرتے سماجی نظام کے خلاف کرھتے ہیں اور اس نظام کے خلاف بغاوت کا درس دیتے ہیں۔ اقبال ساجد کے ہاں مزاحمت زندگی کی محرومیوں سے جنم لیتی ہے۔ اس لیے وہ ظلم سہنے کی بزدلی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یوسف حسن کے ہاں احتجاج انقلاب مزاحمت اور بغاوت کے عناصر ان کی ترقی پسند فکر سے جنم لیتے ہیں۔ ان کی فکر میں سماجی بغاوت کا تصور محض انار کی نہیں پھیلاتا بلکہ وہ استحصالی جابرانہ نظام کے متبادل ایک ہمہ گیر اشتراکی انقلاب کا تصور رکھتے ہیں۔ یوسف حسن کی انقلابی اور مزاحمتی فکر کا جوہر مارکسزم ہے۔ اس لیے وہ طبقاتی پیداواری رشتوں سے پاک محنت کی عظمت پر مبنی سماج کے قیام کا خواب دیکھتے ہیں۔ یوسف حسن کی شاعری سماجی و پیداواری حالات سے تشکیل پاتی ہے۔ وہ انقلاب کا مربوط، جامع اور غیر مبہم نظریہ رکھتے ہیں۔ سامراجی صارفیت منڈی کی معیشت، سرمایہ دارانہ استحصالی رشتے، بازار کی اجارہ داری جیسے موضوعات سے وہ شاعری کو عصری معنویت عطا کرتے ہیں۔

تنویر سپرا اقبال ساجد اور یوسف حسن کے ہاں کا گہرا ادراک اور شعور ملتا ہے۔ ایک ایک حقیقی ادب سماجی مسائل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے ترقی پسند ادب کے بنیادی سانچے کے مطابق ادب، ادیب اور سماج ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک ادیب اپنے معاشرے میں پائے جانے والے مسائل سے قطع نظر نہیں

کر سکتا۔ وہ جس سماج میں رہتا ہے اس سماج کے مسائل سے اس کا شعور متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ادیب کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنے ادب کی جڑیں اپنے سماج میں پیوست رکھے اور سماجی مسائل کو نہ صرف ادب کے حصہ بنائے بلکہ وہ ان مسائل کی حقیقی وجہ اور حل کے لیے بھی نئی راہیں تراشتے۔ ترقی پسند ادب کی بنیادی سماجی مسائل پر تھی۔ اس لیے اس فکر سے منسلک شعرا نے اپنے اپنے دور کے مسائل کا سماجی تجزیہ کرتے ہوئے ادب کے ذریعے اس کی ترجمانی بھی کی۔

تنویر سپرا کا طبقاتی شعور شاعری اپنے دور کے اہم سماجی مسائل کی نشان دہی کرتی ہے۔ نئے عہد میں انسانی زندگی پر مشینوں کے اثرات اور مشینی زندگی کے مسائل کا تنویر سپرا نے اپنی شاعری میں احاطہ کیا ہے۔ تنویر خود ایک مزدور شاعر تھا۔ اس لیے ان کے ہاں اعصاب کو شل کرتی ہوئی مشینوں، چنگاری، بوموں کے ساتھ شفٹوں اور اوور ٹائم میں منقسم ایک مزدور کی زندگی کے المیے کا تاثر بھی موجود ہے دراصل انسانی نفسیات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سپرا کے ہاں دیگر عمومی سماجی مسائل جیسا کہ غربت، بھوک، بے روزگاری، ننگ، افلاس، جہالت، بیماری، چاپلوسی، منافقت، ذات پات کی تقسیم، خود غرضی کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ سپرا کا طبقاتی و سماجی زندگی کی کشمکش، ناسازگار حالات، غربت، مفلسی، سرمایہ داری و جاگیر داری کے استحصال اور مزدور طبقے کے استحصال سے عبارت ہے۔ تنویر اسپرانہ صرف سرمایہ داری نظام کے استحصال کے خلاف طبقاتی شعور رکھتے ہیں بلکہ تخلیقی سطح پر اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کے طبقاتی شعور کا اظہار ان کے شعروں میں ہوتا ہے جہاں وہ اپنی محنت کے حق سے دستبردار ہونے سے انکاری ہیں اور سرمایہ داروں، وڈیروں، جاگیرداروں کے خلاف جبر و استحصال کے خلاف شدید غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ تنویر سپرا کے بالغ سماجی شعور اور طبقاتی شعور سے ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام کا نقشہ ابھرتا ہے۔ جو مساوات، انصاف، بھائی چارے، امن پر مبنی اشتراکی سماج کے قیام کا خواب ہے۔

اقبال ساجد کا طبقاتی و سماجی شعور انسانی سماج کے مسائل اور طبقاتی طرز معاشرت سے پیدا ہونے والی صورت حال سے عبارت ہے۔ اقبال ساجد کا شعور طبقاتی نظام کے خلاف شدید غم و غصے اور ناراضی کے اظہار پر مبنی ہے۔ وہ اس شعور کی بدولت استحصالی نظام اور اس کے پروردہ لوگوں کے خلاف اپنی شاعری میں سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال ساجد کے ہاں تقسیم کے بعد ایک نئے سماج اور ملک کے قیام ہونے کا خواب تھا۔ جہاں تمام انسان مساوات، عدل، جمہوریت کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ مگر ان کے شعور کو اس وقت شدید دھچکا لگا۔ جب اس نئے ملک پر بھی غیر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے قبضہ کر لیا اور عام لوگوں کے حصے میں وہی بھوک اور غربت آئی۔ اقبال ساجد کی شاعری ایسے طبقاتی نظام پر شدید طنز ملتا ہے۔ وہ اس غیر فطری نظام سے مایوس بھی ہوتے ہیں اور اس مایوسی میں کافی شاکی بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال ساجد کے شعور میں فرد کے احساس زیاں کا بھی

گہرا ادراک ملتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے استحصال سے یہ ایک ایسی سماجی صورت حال کا اظہار ہے جس میں انسان اپنے معاشرے سے کٹ کر سماجی بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بنیادی ضروریات زندگی، عادی معاشرہ اور محرومیوں کا شکار لوگ ایک ایسے سماجی نظام کی دین ہیں جو انسانوں کے درمیان امیر اور غریب کی تفریق پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اقبال ساجد انسانوں سے ہونے والے اس بھید بھاؤ کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ وہ اس کے خلاف شدید غم و غصہ کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ اقبال ساجد کا طبقاتی شعور طبقات کی پہچان تو کرتا ہے وہ نظام کی بنیادی خامی کی بھی نشان دہی کرتے ہیں۔ مگر ان کا طبقاتی و سماجی شعور کسی مخصوص انقلابی تصور کے بجائے ایک انسان دوست معاشرے کی تشکیل کا خواب دیکھتا ہے۔ اس کی نسبت یوسف حسن کا طبقاتی و سماجی شعور خالصتاً مارکسی فکر سے نمو حاصل ہوتا ہے۔

یوسف حسن کی شاعری سماجی و طبقاتی شعور کی بہترین مثال ہے۔ ان کا طبقاتی شعور عصری زندگی کا جامع احاطہ کرتی ہے یوسف حسن کا سماجی و طبقاتی شعور ان کے گہرے مطالعے اور سماجی مشاہدے کی بدولت ہے۔ ان کا طبقاتی شعور اپنا خمیر مارکسزم سے اٹھاتا ہے۔ اپنے اس طبقاتی شعور کی بدولت وہ مارکسزم کی سائنس کو سماج اور سماجی و پیداواری رشتوں کی تفہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یوسف حسن کا سماجی شعور عالمی سرمایہ داری نظام اور منڈی کی معیشت سے پیدا ہونے والی اخلاقیات اور بحران کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس سماجی مشاہدے اور طبقاتی ادراک سے وہ نیولبرل اکانومی سے پیدا ہونے والے مسائل کی بہت جاندار انداز میں پیشکش کرتے ہیں۔ "بازار" کی اصطلاح دراصل اس اجارہ دار نظام کا عمدہ علامتی اظہار ہے۔ یوسف حسن عصری زندگی کے اہم مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ "بازار" یعنی اجارہ معشیت کے انسانی زندگی پر خوف ناک اثرات کا اظہار بھی ان کی شاعری کا اہم پہلو ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ترقی پسند ادب نے ہر زمانے کے ادب پر انمٹ نقوش مرتب کیے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایام زمانہ کے ہاتھوں تحریک کی شکست کے باوجود اس فکری رجحان نے ایک دنیا کو متاثر کیا اور یہ فکر نئے دور میں جدید عصری تقاضوں کو ہم آہنگ کرتے ہوئے آج بھی کارگر ہے۔ تنویر سپرا اقبال ساجد کی شاعری ترقی پسند فکر کی عالمگیریت اور جدید اسالیب کی بہترین مثال ہے۔ تینوں شعرا کے ہاں ترقی پسندی بنیادی فکر کے طور پر شامل ہے۔ اگرچہ تینوں منتخب شعرا کے ہاں اس کا اظہار ایک الگ ہے۔ مقالے میں تینوں شعرا کی شاعری کے ترقی پسند مضامین اور سانچے کے مطابق مطالعہ کرنے کے ساتھ تقابل کی بھی کاوش کی گئی ہے۔

## تحقیقی نتائج:

ا۔ منتخب شعرا کے ہاں جدید دور کے معاشی مسائل کا گہرا طبقاتی ادراک موجود اور عصری زندگی کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ ان کی شاعری ادب برائے زندگی کے معیار پر پورا اترتی ہے۔

ب۔ احتجاج، انقلاب، مزاحمت اور بغاوت انسان کی فطرت میں شامل ہیں۔ انسانیت اپنے ارتقائی سفر میں جبر و استحصال کے خلاف ہمیشہ مزاحم کار رہی ہے۔ مذکورہ عناصر ترقی پسند فکر کے عالمگیر فکری رجحانات ہیں۔ منتخب ترقی پسند شعرا کے ہاں ان فکری رجحانات کا پختہ اظہار ملتا ہے۔

ج۔ جدید ترقی پسند شعرا (تنویر سپرا، اقبال ساجد، یوسف حسن) کے ہاں ترقی پسندی نئے اور جدید مفاہیم کی صورت میں اظہار پذیر ہوئی ہے۔ ان شعرا نے ترقی پسند فکر کے روایاتی عناصر کے ساتھ ساتھ نئی جہات کو روشناس کرایا ہے۔

د ترقی پسند تحریک کے خاتمے کے باوجود ترقی پسند فکر کا فکری تناظر اور ارتقا آج بھی قائم ہے۔ جدید دور میں بھی ترقی پسند فکر ایک عالمگیر رجحان ثابت ہو رہی ہے۔ منتخب شعرا کے ہاں ترقی پسند فکر جمود کا شکار نہیں ہوتی بلکہ ترقی پسند فکر متحرک اور کارآمد فکر کے طور پہ ظاہر ہوئی ہے۔

## سفارشات:

ا۔ اکیسویں صدی میں ترقی پسندی کے جدید رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان رجحانات کا مطالعہ ادب کے تناظر میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ب۔ اکیسویں صدی کے سماجی و معاشی مسائل پر ترقی پسند نقطہ ہائے نظر کا اطلاق کرتے ہوئے معاشی نظاموں اور تہذیبی رویوں کی جانچ کارگر ہو سکتی ہے۔

ج۔ تنویر سپرا اقبال ساجد اور یوسف حسن کے ہاں نیو لبرل معاشی مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے ان شعرا کے شاعری کا اس مخصوص نقطہ ہائے نظر مطالعہ سندی تحقیق کے لیے نیا باب کھول سکتا ہے۔

# کتابیات


احمد، عزیز۔ترقی پسند ادب۔دہلی:کاروان ادب،۱۹۸۶ء۔

احمد فیض، فیض۔میزان۔لاہور: منہاس اسٹریٹ پیپر اخبار، ۱۹۸۲ء۔

اختر، جاوید۔لینن اور جمالیات۔کوئٹہ: غزنوی پبلشرز، ۲۰۱۳ء۔

اعظمی، خلیل الرحمن۔اردو ادب میں ترقی پسند تحریک۔ علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۷۲ء۔

اقبال شمیم، آفتاب۔جہاں گری مشمولہ اے دل اے دریا۔راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹

انجینئر، اصغر علی۔مارکسی جمالیات۔ لکھنو: نصرت پبلشرز، س۔ن

بٹ، محمد افضال۔اردو ناول میں سماجی شعور مقالہ برائے پی ایچ ڈی ، نمل یونیورسٹی، ۲۰۰۶

بریلوی، عبادت۔جدید شاعری۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، ۱۹۷۳ء۔

پاشا، انور۔ہند و پاک میں اردو ناول تقابلی مطالعہ۔ نئی دہلی: پیش رو پبلی کیشنز، ۱۹۹۲

پراچہ، احمد۔ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰

تاثیر، محمد دین۔ادب میں ترقی پسندی کے مفہوم۔علی گڑھ بک ڈپو: مقالات، مجلس ترقی، س۔ن۔

تقی، یوسف۔ترقی پسند تحریک اور اردو نظم۔کلکتہ: دیار فکر و فن، ۱۹۸۰ء۔

جاوید، ریاض۔طبقاتی شعور اور ادب۔مشمولہ سویرہ شمارہ نمبر ۹۔لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۵۱

جعفری، جواز۔اقبال ساجد ایک ناراض خو شاعر مشمولہ کلیات اقبال ساجد۔لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴

جعفری، جواز۔ایک ناراض خو شاعر مشمولہ کلیات اقبال ساجد۔لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴

جعفری، سردار۔ ترقی پسند ادب۔لاہور: مکتبہ پاکستان، س۔ن

جعفری، سردار۔ گفتگو۔ بمبئی: وڈیرا پبلی کیشنز، ۱۹۸۰

جعفری، علی سردار۔ترقی پسند ادب کا سماجی پس منظر۔دکن: اردو اکیڈمی، ۱۹۵۶ء۔

حسن، سبط۔موسی سے مارکس تک: کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۴

حسن، یوسف، مضمون مشمولہ لفظ کھردرے۔راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹

حسن، یوسف۔ اے دل اے دریا۔ راولپنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹

حسن، سبط۔ سخن در سخن۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۹ء۔

حسین، احتشام۔ تنقیدی جائزے۔ لکھنو: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۷۸ء۔

حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات۔ اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان اردو، ۲۰۱۸، ص ۱۶۶

حنفی، شمیم۔ غزل کا نیا منظر نامہ۔ علی گڑھ: مکتبہ الفاظ، ۱۹۸۱ء۔

رائے پوری، اختر حسین۔ ادب اور انقلاب، حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۳

رائے پوری، اختر حسین۔ ادب اور زندگی۔ دکن: مطبع انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵ء۔

رئیس، قمر۔ ترقی پسند ادب کے معمار۔ دہلی: نیا سفر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶

رئیس، قمر۔ کاظمی، سید عاشور۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴

رئیس، قمر۔ ترقی پسند ادب کے معمار۔ دہلی: نیا سفر پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔

رئیس، قمر۔ عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر۔ دہلی: نیا سفر پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء۔

ساجد، اقبال۔ تکمیل۔ اسلام آباد: بدلتی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷

ساجد، اقبال۔ کلیات اقبال ساجد، مرتبہ: جواز جعفری، شکیل الرحمن۔ لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۴ء۔

سپرا، تنویر۔ لفظ کھردرے۔ جہلم: بک کارنر، ۱۹۸۰ء۔

سجاد ظہیر، کلیات سجاد ظہیر، مرتبہ نجمہ ظہیر، باقر علی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو

سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ء۔

شادانی، عندلیب۔ دور حاضر اور اردو غزل گوئی۔ دہلی: پرویز بک ڈپو، ۱۹۴۵ء۔

صادق، محمد۔ ترقی پسند اردو غزل کا آغاز و ارتقا۔ دہلی: کتاب دنیا، ۲۰۱۲

ظہیر، سجاد۔ روشنائی، لاہور: پرائم ٹائم پبلی کیشنز، ۲۰۰۶

ظہیر، سجاد۔ یادیں مشمولہ گفتگو۔ بمبئی: وڈیرا پبلی کیشنز، ۱۹۸۰

ظہیر، کلیات سجاد ظہیر، مرتبہ نجمہ ظہیر، باقر علی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۶

عباسی، عبدالباری۔ تیکھی تحریریں۔ جہلم: تنظیم الادب، ۱۹۸۶

عبداللہ، سید۔ اردو ادب کی ایک صدی۔ دہلی: لیتھو پریس، س۔ن

عثمان، اختر۔ فلیپ اے دل اے دریا۔ راولپنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹

علی، احمد۔ترقی پسند تحریک کا پس منظر۔کراچی: مکتبہ افکار، ۱۹۷۴
فاطمی، علی احمد۔ترقی پسند تحریک سفر در سفر۔الہ آباد: ادارہ نیا سفر، ۲۰۰۶ء
قاسمی، احمد ندیم۔صداقت کی شاعر مشمولہ تنویر سپرا اہل قلم کی نظر میں۔لاہور: شرکت پرینٹنگ پریس، ۱۹۹۴
کاشمیری، ظہیر۔ادب کے مادی نظریے ۔لاہور: کمال پبلشرز، س۔ن
گورکھپوری، مجنوں۔ادب اور زندگی۔گورکھپور: ایوان اشاعت، س۔ن
لکھنوی، صہبا۔رومانی، انجم۔ ارمغان مجنوں۔کراچی: مجنوں اکیڈمی، س۔ن
لینن۔اشتراکی نظریات اور ثقافت۔مترجم: مرزا اشفاق بیگ، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۳ء
لینن۔ادبی مسائل۔ماسکو: دارالاشاعت ترقی، ۱۹۷۴ء۔
مارکس، کارل۔اینگلز، فریڈرک۔کمیونسٹ مینی فیسٹو۔لاہور: فکشن ہاؤس۔۲۰۰۸
محمد عقیل، سید۔ترقی پسند تحریک کی تنقیدی تاریخ۔الہ آباد: ادارہ نیا سفر، ۲۰۰۹
منٹو، عابد حسن۔پیش لفظ اے دل اے دریا۔راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹
نقوی، جمال۔ ترقی پسند تحریک کا سفر ،لاہور پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸
نقوی، جمال۔ترقی پسند ادب اور سجاد ظہیر۔ کراچی: ادارہ تزئین دانش، ۲۰۰۲ء
ووڈز، ایلن۔ گرانٹ، ٹیڈ۔ مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸
یاور، یعقوب۔ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری۔کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء
یوسف حسن، مضمون مشمولہ لفظ کھردرے۔راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۹

رسائل و جرائد:

حسن، یوسف۔ ادبی ترقی پسندی کے فکری و فنی مسائل مشمولہ نقاط مشمولہ نقاط: فیصل آباد، نقاط مطبوعات، ۲۰۰۶
حسن، یوسف۔ترقی پسند اور ترقی پسندی مشمولہ بیاض۔لاہور: بیاض گروپ آف پبلی کیشنز، ۲۰۰۲
شبیر، رانا غلام۔تنویر سپرا : کوہکن کی بات گئی کوہکن کے ساتھ مشمولہ ادبیات ، جلد ہفتم۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۴

طاہر، رمضان۔ یوسف حسن کی غزل میں سماجی و طبقاتی شعور مشمولہ الاعجاز۔ مٹیاری: ستمبر ۲۰۲۱

فیروز، انوار۔تنویر سپرا کے لیے مشمولہ ، تنویر سپرا اہل قلم کی نظر میں۔لاہور: شرکت پرینٹنگ پریس، ۱۹۹۴

برقی مآخذات:

محمد علی عمیر، "نیولبرلزم:وہ نظریہ جو تمام مسائل کی جڑ ہے"، تاریخ ملاحظہ ۳۰ اگست ۲۰۲۲ء، وقت شام چار بجے

Http://humsub.com/newlibrisim

ندیم، منصور۔نیو لبرل ازم کیا ہے؟۔ مکالمہ۔مارچ ۲۱۰۸ء، وقت صبح دس بجے

Http://mukalam.com/newlibrisimkyaha

International Islamic Univ
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD.